تعلیم
تربیت

عاشق شہزاد، لاہور	محمد اعجاز، لاہور	سیمی محمد اعظم، لاہور	اظہار احمد، کراچی

مدیرِ اعلیٰ
عبدالسلام خان
سینتیسواں سال ، ساتواں شمارہ
ماہ اکتوبر ، ۱۹۷۷ء
ماہنامہ
تعلیم و تربیت
لاہور
مطبوعہ فیروز سنز لاہور
باہتمام عبدالسلام خان پرنٹر و پبلشر
پتا : "ماہنامہ تعلیم و تربیت"
۶۰- شاہراہ قائدِاعظمؒ ، لاہور
قیمت سالانہ : ۲۰/۰۰
قیمت فی پرچہ ۱/۷۵

- اللہ لوگوں کے حق میں مہربانی کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔
- خُدا ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔
- خُدا اُس سے بے خبر نہیں جو وہ (لوگ) کرتے ہیں۔
- حق آپؐ کے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اس لیے آپؐ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔
- نیکیوں میں ایک دُوسرے سے آگے بڑھو۔
- تم لوگوں سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو تاکہ میں تم پر اپنی مہربانی مکمل کردوں اور تم ہدایت پاؤ۔
- ہم نے تم میں تمھی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم پر ہماری آیات پڑھتا ہے اور تمھیں پاک کرتا اور تمھیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور تمھیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔
- تم مجھے یاد کرتے رہو، میں تمھیں یاد کرتا رہوں گا۔ میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔
- اے ایمان والو! تم صبر اور نماز کے ذریعے سے مدد طلب کرو۔ بے شک خُدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
- جو خُدا کی راہ میں قتل کر دیے جائیں، تم اُنھیں مُردے نہ کہو۔ وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے۔
- ہم تمھیں کسی قدر خوف اور بھُوک کے ساتھ اور مالوں، جانوں اور پھلوں کو کم کرکے ضرور آزمائیں گے اور آپؐ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجیے، وہ جن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم خُدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں، جن پر اُن کے رَبّ کی طرف سے مہربانیاں اور رحمت ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔

(انتخاب اور ترجمہ از ادارہ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اداریہ

عزیز بچو! کچھ بچوں نے ہم سے پوچھا ہے کہ کیا ہم نے سوال و جواب کا صفحہ ختم کر دیا ہے؟ اس کے جواب میں آپ کو یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم نے وہ صفحہ ہرگز ختم نہیں کیا اور نہ ہم آیندہ اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ صفحہ کسی شمارے میں نظر نہ آئے تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ ہمیں مناسب سوال نہیں آئے۔

اکثر بچے ہم سے کچھ ایسے سوال کر دیتے ہیں جن کا جواب ہمیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا یا پھر ہم وہ جواب دینا بچوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر اگر ایک بچہ ہم سے یہ سوال کرتا ہے کہ ہمارے ملک کا آیندہ وزیر اعظم کون ہو گا تو آپ ہی سوچیے کہ ہم اس سوال کا جواب کیا دیں۔

یہ ہم نے ایک مثال دی ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے سوال ایسے ہوتے ہیں جو بچوں کے پرچوں کے لیے کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اس لیے اگر آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ "جوابستان" کا صفحہ باقاعدگی کے ساتھ ہر شمارے میں شامل ہو تو مناسب سوال بھیجا کیجیے۔

بعض بچوں نے قلمی دوستی کے صفحے کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ بعض شماروں میں وہ غائب ہوتا ہے۔ یہ شکایت بھی درست ہے۔ دراصل آپ کو یاد ہو گا کہ ہم نے جب یہ صفحہ شروع کیا تھا تو اس کی ابتدا میں دو تین شماروں میں مسلسل یہ ہدایت کر دی تھی کہ اس سلسلے میں لڑکے صرف لڑکوں کو اور لڑکیاں صرف لڑکیوں کو خط لکھ سکتی ہیں لیکن ہم آج افسوس کے ساتھ آپ کو بتا رہے ہیں کہ بعض بھائیوں نے اس پابندی پر عمل نہیں کیا، جس کے بارے میں ہمیں شکایتیں بھی پہنچی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس صفحے میں سوچ سمجھ کر اور کم از کم نام اور پتے چھاپتے ہیں۔

(ادارہ)

Scanned by CamScanner

انجم وزیر آبادی

میرا داتا سب کا داتا
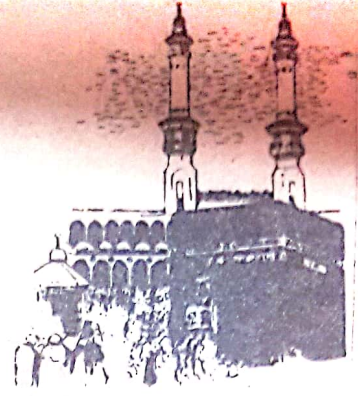
کالی گھٹائیں کون ہے لاتا　　ٹھنڈی ہوا ہے کون چلاتا
دن اور رات ہے کون بناتا　　میرا داتا، سب کا داتا

کس کے ہیں یہ چاند ستارے　　کس کے ہیں یہ گلشن سارے
کون ہے جو ان کو ہے سجاتا　　میرا داتا، سب کا داتا

کس کا ہے یہ رُوپ یہ جوبن　　یہ پربت، یہ باغ، یہ گُلشن
کون ہے ان کی شان بڑھاتا　　میرا داتا، سب کا داتا

چنچل ندیاں، گہرے ساگر　　کس کی شان بڑھائیں بہہ کر
کون ہے جو ان کو ہے بہاتا　　میرا داتا، سب کا داتا

صُبح کا نُور، شب کے سائے　　سُورج ڈُوبے، چندا آئے
ان کو وقت پہ کون ہے لاتا　　میرا داتا، سب کا داتا

اُونچی فضا میں آتے جاتے　　پنچھی کس کے ہیں گن گاتے

انجم کس کے گیت ہے سُناتا
میرا داتا، سب کا داتا

محمد احمد شاد

پاکستانی بچے
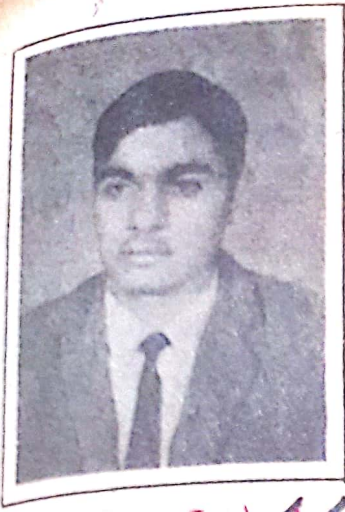
ننھے منے بچے ہیں ہم
اپنے قول کے سچے ہیں ہم
قوم کی خدمت کام ہمارا
اونچا ہر دم نام ہمارا
سیدھی راہ پہ چلتے ہیں ہم
دشمن سے کب ڈرتے ہیں ہم
لے کے سچے دین کا پرچم
آگے بڑھتے جائیں گے ہم
جب تک جسموں میں ہیں جانیں
اپنے رب کو حاکم مانیں
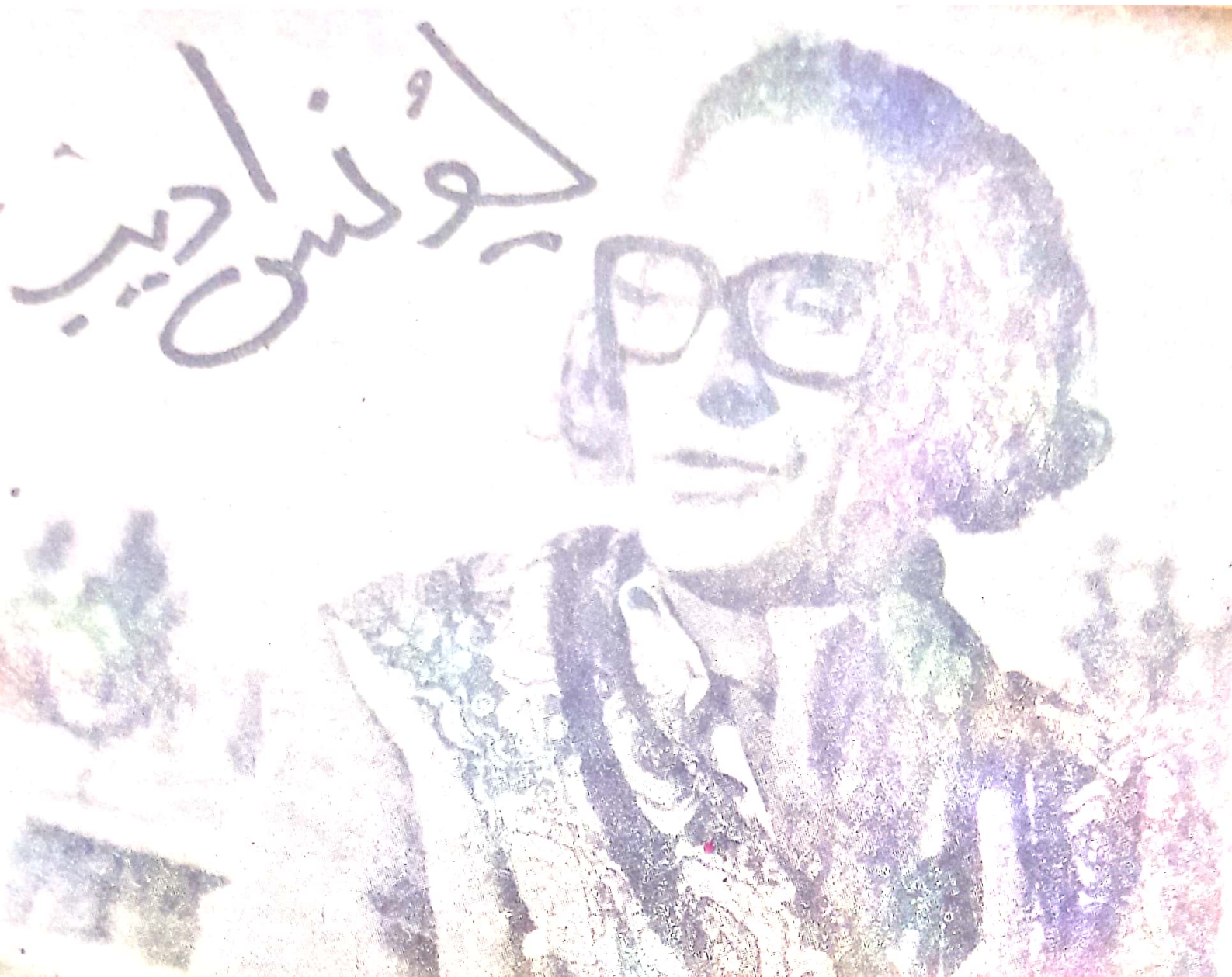
یونس ادیب

یُونس ادیب بہت سی صلاحیتوں کے آدمی ہیں۔ وہ ابھی نوجوان ہی تھے ایک ادبی رسالے "آواز" لاہور کے ایڈیٹر بن گئے۔ یہ رسالہ اُن دِنوں نوجوان شاعروں اور ادیبوں میں بہت مقبول تھا۔ افسوس کہ وہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔

یُونس ادیب شروع شروع میں صرف بڑوں کے لیے لکھتے تھے۔ میں اُن دِنوں اُنھیں ایک شاعر ہی سمجھتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد مجھے اُن کے ایسے مضمون بھی دیکھنے کا موقع مِلا جو نثر میں لکھے گئے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد شاہراہِ قائداعظم لاہور کی ایک مشہور عمارت وائی ایم سی اے میں ایک ادبی تنظیم "حلقۂ ارباب علم" کے انتظام کے تحت ہر ہفتے ادبی اجلاس ہوتے تھے جن میں عام طور پر ایک مقالہ نگار اپنا مقالہ یا مضمون، ایک افسانہ نویس اپنا افسانہ یا کہانی اور ایک شاعر اپنی نظم یا غزل پیش کرتا تھا۔ اور باقی لوگ اس کے بارے میں اپنی اپنی رائے دیتے تھے۔ اس حلقے کے صدر آغا بیدار بخت، نائب صدر ملک اسلم حیات اور ناظم اعلیٰ سیّد نظر زیدی تھے۔ آج سے تقریباً ۲۵ برس پہلے میں اس حلقے کا نائب ناظم تھا۔ اس حلقے کے اجلاسوں میں کبھی کبھی یونس ادیب بھی شامل ہوتے تھے اور بعض دفعہ اپنے افسانے تنقید کے لیے پیش کرتے تھے۔ اُن کا رجحان نثر کی طرف ہونے کے بعد میری نظر سے پھر اُن کی کوئی نظم یا غزل وغیرہ نہیں گزری۔ شاید اُنھوں نے اپنے نام کی مناسبت سے ایک "شاعر" سے زیادہ "ادیب" کے طور پر ادب کی خدمت جاری رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

یُونس ادیب نے بڑوں کے لیے بھی کافی کچھ لکھا ہے۔ بچّوں کے لیے شاید اُنھوں نے بہت بعد میں لکھنا شروع کیا لیکن اُنھوں نے بچّوں کے لیے اب تک جس قدر لکھا ہے، اُس کی وجہ سے وہ بچّوں کے ادیبوں میں بھی شمار ہونے لگے ہیں۔ اُنھوں نے بچّوں کے لیے جو کچھ لکھا ہے، اُس کا ذکر کرنے سے پہلے ہم اس پہلو پر غور کرلیتے ہیں کہ اُنھوں نے بڑوں کے لیے کس قدر کام کیا ہے:

یُونس ادیب نے بڑوں کے لیے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ بعض لوگوں کے حالاتِ زندگی وغیرہ بھی لکھے ہیں۔ مثلاً یُونس ادیب نے بڑوں کیلئے "صندل کی آگ"

کے عنوان سے ایک ناول لکھا ہے جو کافی حد تک پسند کیا گیا ہے۔ اُن کے افسانے شاید ابھی تک کتابی صورت میں نہیں چھپے۔

عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن محمد علی آج کی دنیا میں ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں، جن کے نام سے شاید دُنیا کا بچّہ بچّہ واقف ہے۔ یُونس ادیب نے "محمد علی۔ ایک عظیم باکسر" کے نام سے کتاب لکھ کر اُن کی زندگی کے حالات اور مکا بازی کے میدان میں اُن کے عظیم کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ یُونس ادیب کی اس کتاب سے پہلے شاید اُردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں تھی۔

یُونس ادیب میرے خیال میں ایک عجیب شخص ہیں۔ زندگی میں اُن پر مختلف رنگ آئے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے مختلف وقتوں میں مختلف قسموں کی کتابیں لکھی ہیں۔ اُن کے مختلف رنگوں میں ایک رنگ یہ بھی ہے کہ ایک زمانے میں اُنھوں نے بزرگانِ دین کے حالات پڑھے اور اُن سے متأثر ہو کر پھر ایسی کتابیں لکھیں جو خاص طور پر تصوّف کے موضوع پر ہیں حالانکہ وہ خُود کسی زمانے میں بھی "صُوفی" نہیں رہے بلکہ اُن کا شمار آزاد منش لوگوں اور رندوں ہی میں ہوتا رہا ہے۔ بہر حال تصوّف کے موضوع پر اُن کی ان دو کتابوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

- امامِ تصوّف :۔ یہ کتاب مشہور بزرگ حضرت جُنید بغدادیؒ کے بارے میں ہے۔
- داتا علی ہجویریؒ :۔ اس کتاب کا موضوع اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ اِس میں نامور بزرگ حضرت علی بن عثمان، ہجویری المشہور داتا گنج بخش کی زندگی کے حالات وغیرہ کا ذکر ہے۔

یُونس ادیب نے ملک کے ایک سیاسی راہنما کے بارے میں بھی دو کتابیں لکھی ہیں۔ یہ کتابیں دیکھ کر اُن کے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ اُنھیں سیاست کے کانٹوں سے نہیں اُلجھنا چاہیے تھا کیوں کہ سیاسی شخصیتوں کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ جس شخص کو دیکھ کر آج لوگ تالیاں بجاتے ہیں، کل کو اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ بہر حال اب تو وہ یہ کتابیں لکھ چکے ہیں اور نہ جانے کہ اُنھوں نے یہ کس مجبوری کے تحت لکھی ہیں۔

یُونس ادیب مختلف وقتوں میں بعض رسالوں کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ "آواز" کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ایک زمانے میں وہ ماہنامہ "لالہ زار" کے ایڈیٹر تھے۔ پھر ایک وقت آیا، جب وہ ہفتہ وار "برق" مرتب کرتے رہے۔ ایک زمانے میں وہ ایک فلمی ہفت روزہ "ممتاز" میں بھی ایڈیٹر کی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے ہیں۔

ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور جس زمانے میں بہت مقبول تھا، یُونس ادیب اُس کے مستقل فیچر رائٹر تھے۔

وہ پاکستان میں ہفتہ وار "ایشیا" لندن کے نمائندے بھی رہے ہیں۔

اُنھیں بعض اخباروں میں بھی کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ کچھ عرصے تک وہ روزنامہ "احسان" لاہور میں معاون مدیر رہے ہیں اور ایک وقت میں وہ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کے میگزین ایڈیٹر تھے۔

اب آیئے یہ دیکھتے ہیں کہ یُونس ادیب نے بچّوں کے ادب کو کیا دیا۔ اُنھوں نے بچّوں کے لیے جو کچھ لکھا ہے، اُس میں ناولوں کے علاوہ کہانیاں بھی شامل ہیں۔

اُن کے ناولوں میں "درخت کا آسیب" اور "بہادر سلمیٰ" خاص طور پر بچّوں میں پسند کئے گئے ہیں اور لاہور کے ایک اشاعتی اِدارے کے اہتمام سے کئی بار چھپ چکے ہیں۔

اس کے علاوہ اُنھوں نے بچّوں کے لیے جو کہانیاں لکھی ہیں، اُن کی تعداد کافی ہے لیکن ابھی تک اُن کی ایسی کہانیوں کا کوئی مجموعہ چھپ کر بازار میں نہیں آیا۔ شاید وہ جلد ہی اس طرف بھی توجہ دیں کیوں کہ اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے

یُونس ادیب کچھ عرصہ پہلے بچّوں کے ایک رسالے "جگنو" لاہور میں "جگنو کی عدالت میں" کے عنوان سے مضمونوں کا ایک سِلسِلہ ترتیب دیلے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کے جو مضمون خاص طور پر پسند کیے گئے، وہ اشرف صبوحی دہلوی، صوفی تبسّم، عزیز اثری، آغا اشرف، اے حمید، مقبول دہلوی، اشتیاق احمد، شعیب ہاشمی و سُلمیٰ ہاشمی اور کشور ناہید کے بارے میں تھے۔

اب آخر میں اُن کی زندگی کے کچھ ضروری حالات معلوم کر لیجیے۔

تعلیم و تربیت اکتوبر ۱۹۷۷ء

یُونس ادیب آج سے تقریباً پینتالیس برس پہلے لاہور کے ایک مشہور محلّہ رنگ محل میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کا سال پیدائش ۱۹۳۲ء ہے۔ دن، تاریخ اور مہینا خود اُنھیں بھی یاد نہیں ہے، اس لیے کوئی دوسرا اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے۔

وہ پرائمری تک محلّہ واٹر ورکس (پانی والا تالاب) کے ایک سکول میں پڑھتے رہے ہیں۔ میٹرک کا امتحان اُنھوں نے دیال سنگھ ہائی سکول لاہور سے دیا۔ اس کے بعد وہ دیال سنگھ کالج لاہور میں داخل ہوگئے اور وہاں ایف اے تک تعلیم پائی۔ اس سے آگے وہ اپنی مرضی سے نہیں پڑھے یا اُنھیں حالات نے مجبور کر دیا تھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یُونس ادیب آج کل گزشتہ چند برسوں سے ریڈیو پاکستان لاہور میں مسوّدہ نویس (سکرپٹ رائٹر) کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

بچّوں کے لیے وہ آج کل بھی لکھتے ہیں لیکن اس کی رفتار ان کی دوسری مصروفیتوں کے باعث مدّھم ہے۔

میرا خیال ہے کہ اُن پر ملک کے بچّوں کا حق ہر دور میں یکساں ہے، اس لیے اُنھیں بچّوں کے لیے پہلے کی طرح آیندہ بھی لکھتے رہنا چاہیئے۔ اس طرح اُن کے قلم سے یقیناً بچّوں کے لیے اور مفید مضمون اور کہانیاں وجود میں آسکیں گی۔

اقوالِ زرّیں

فرحت تحسین کوثر

- نماز دین کا ستون ہے۔
- ماں باپ کی خوشنودی دنیا میں دولت کا باعث اور آخرت میں نجات ہے۔
- غصّہ عقل کو کھا جاتا ہے جہاں تک ہوسکے اس کو قابو میں رکھیں۔
- غریب وہ ہے جس کا دوست نہیں۔
- دوست اس کو بناؤ جو مصیبت میں کام آئے۔

تعلیم و تربیت اکتوبر ۱۹۷۷ء

رفیق احمد خان

نام کا بابو

الرٹ بلرٹ بادے کا
ہے شوقین دکھاوے کا
سُوٹ نہیں ہے اُسکے پاس
بوٹ نہیں ہے اُسکے پاس
ننگے پاؤں پھرتا ہے
ٹھوکر کھا کر گرتا ہے
ہوتی اُس کے پاس گھڑی
چلتا لے کر ایک چھڑی
سیٹی خُوب بجاتا وہ
چلتے چلتے گاتا وہ
بن جاتا وہ جنٹل مین
اُس کے دِل کو آتا چین
اب وہ نام کا بابو ہے
اب کِس کام کا بابو ہے

ہم اُس رات اُوٹ پٹانگ باتیں کر رہے تھے۔ جب ہمیں کوئی کام نہیں ہوتا تو ہم یہی کام کرتے ہیں اور اِدھر اُدھر کی ہانکتے ہیں۔ یُوں بھی وہ دسمبر کے آخری ہفتے کی رات تھی۔ سردی اپنا لوہا ہمارے دانت بجوا کر منوا رہی تھی۔ جب ہم میں سے کوئی کوئی جملہ بولتا تو پہلے اُس کے دانت بجتے۔

ابوّ اور امیّ اپنے اپنے کام میں مصروف اور ہم پانچوں اپنے کام میں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ابوّ اور امیّ اخبار پڑھنے یا کوئی کتاب دیکھنے اور سوئیٹر بُننے کے سوا کوئی کام نہیں کر سکتے جب ہم نِت نئے کام کرنے کے عادی ہیں۔ اُس رات ہم سکول کے کام سے فارغ ہو چکے تھے اور نیند بھی ہم سے کوسوں دُور تھی، اس لیے اُوٹ پٹانگ

باتیں نہ کرتے تو کیا کرتے ۔ ایسے میں امّی پوچھ بیٹھیں :
"بچو! کیا بے کار کی باتیں لے بیٹھو ہو۔ سکول کا کوئی کام کیوں نہیں کرتے۔"
"جی وہ تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔" آفتاب نے جلدی سے کہا۔
"اچھا .... پھر تو ٹھیک ہے، تم جو چاہو کر سکتے ہو۔" اُنھوں نے خوش ہو کر کہا
"امّی! کیا آپ ہماری اوٹ پٹانگ باتوں میں حصّہ لیں گی۔" اشفاق نے پوچھا۔
"بیٹے! مجھے تو یہ سوئیٹر سونے سے پہلے مکمل کرنا ہے۔" اُنھوں نے گھبرا کر کہا۔
"یہ بھی ٹھیک ہے۔ تو ابّو۔ آپ ہی ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے۔"
"شامل .... مگر کس چیز میں؟" اُنھوں نے چونک کر اخبار سے نظریں ہٹائیں۔
"جی! اوٹ پٹانگ باتوں میں .... جو ہم اس وقت کر رہے ہیں۔" میں نے دہرایا۔
"بیٹے! تم تو جانتے ہو، آج کل سیاسی حالات بہت خراب ہیں اور مَیں نے ابھی تک سارا نہیں پڑھا، اس لیے مجھے تو معاف ہی رکھو۔"
"اچھا خیر .... ہم خود ہی کر لیتے ہیں۔" اخلاق نے شانے اُچکائے۔
"ہاں تو ہم کیا باتیں کر رہے تھے؟" تسلیم نے پوچھا۔
یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس وقت ہم اپنے اپنے بستر میں دبکے ہوئے تھے۔ صرف ہمارے منہ لحافوں سے باہر تھے۔ کمرے میں سو والٹ کا بلب روشن تھا۔
"خدا جانے ہم کیا بات کر رہے تھے۔ امّی کے جملے نے سب کچھ بھلا دیا۔" میں نے کہا: "تو کیا ہوا، ہم کوئی اور بات شروع کر دیتے ہیں۔" اخلاق جلدی سے بولا:
"ٹھیک ہے مَیں شروع کرتا ہوں۔
فرض کرو، ہمارے گھر میں اچانک کوئی چور گھس آئے۔ بلکہ ابھی اسی وقت ... تو ہم کیا کریں گے۔"
"چور .... کہاں ہے چور۔" امّی نے بوکھلا کر کہا۔
"کیا بات ہے۔ کیا کوئی چور گھس آیا ہے۔" ابّو نے چونک کر کہا۔
"اوہو .... نہیں .... ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم تو یونہی باتیں کر رہے ہیں۔

میں کہہ رہا تھا، فرض کیا ہمارے گھر میں
اس وقت کوئی چور گھس آئے ..... آفتاب
نے انھیں بتایا۔

"یہ کوئی حساب کا سوال تو ہے نہیں،
پھر ہم فرض کیوں کریں"۔ میں نے گھبرا کر کہا،
کیوں کہ مجھے ایسے سوالوں سے چڑ ہے جن
جن میں فرض کیا جاتا ہے۔ "یہ تمھارا آپس
کا معاملہ ہے۔ فرض کرو یا نہ کرو"، ابّو نے
کہا اور دوبارہ اخبار میں گم ہو گئے۔ امّی نے
سرے سے کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ "میرا
خیال ہے کہ آفتاب نے ایک دلچسپ سوال
اُٹھایا ہے"۔ میں نے کہا "تو چلو۔ اسی
پر بحث کیے لیتے ہیں۔ ہاں تو ایسی صورت
میں ہم کیا کریں گے"۔ "یہ تو بہت مشہور
بات ہے کہ چور کے پاؤں کہاں..... چور
بہت ڈرپوک ہوتا ہے۔ اگر اس سے
خوف نہ کھایا جائے تو وہ خود ہی ڈر کر
بھاگ جاتا ہے۔ اس لیے تو میں تو اس
سے ہرگز نہیں ڈروں گا۔ بلکہ اس کے
سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو جاؤں گا"۔ اشفاق
نے اکڑ کر کہا:

"بالکل ٹھیک، میں اپنا لحاف اُٹھا
کر اُس کے اوپر ڈال دوں گا۔ اور پھر ہم
مل کر اُس پر ٹوٹ پڑیں گے"۔ اخلاق

نے اشفاق کا ساتھ دیا۔ "میں فوراً دروازے کی طرف دوڑ کر جاؤں گا اور اُسے باہر سے بند کرتے ہوئے شیخ صاحب کے گھر سے پولیس کو فون کر دوں گا۔"
میں نے سینہ تان کر کہا:
"میں دوڑ کر ایک رسّی لے آؤں گی اور لحاف سمیت چور کو جکڑ دوں گی۔"
نسیم نے کہا۔
"رہ گیا میں ..... تو میں یہ کروں گا کہ غسل خانے سے کپڑے دھونے والا ڈنڈا اُٹھا لاؤں گا اور اسے چور پر برسانا شروع کر دوں گا۔"
آفتاب بولا:
"اور ابّو آپ کیا کریں گے۔" میں نے ابّو کی طرف مُنہ کر کے کہا۔
"بیٹے سیاسی حالات ...."
"اوہ ہاں۔ یاد آیا۔ آپ کو اخبار ختم کرنا ہے، اس لیے آپ چور کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔" آفتاب نے کہا۔
"اور مجھے سوئیٹر ختم کرنا ہے۔" امّی مُسکرائیں۔
"خیر کوئی بات نہیں۔ اتنی دیر میں پولیس آ ہی جائے گی۔"
"اور اُسے ہتھکڑی لگانے کے بعد ہم سب کی بیٹھ ....." میرے الفاظ درمیان ہی رہ گئے کیوں کہ اُسی وقت "دھم" کی آواز ہمارے کانوں میں آئی تھی۔
"یہ آواز کیسی تھی؟" میرے منہ سے نِکلا۔
"شاید کہیں بجلی گری ہے۔" اشفاق ہکلایا۔
"ہشت ..... بجلی گرنے کی آواز ایسی ہوتی ہے؟" میں نے بُرا سا مُنہ بنایا۔
"تو پھر ....." اشفاق کہتے کہتے رک گیا۔
کمرے کا دروازہ ایک دم کھلا تھا۔ ہم سب کے مُنہ سے چیخیں نکل گئیں۔ دروازے میں ایک شخص کپڑے سے چہرہ چھپائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں۔
"تت ..... تم ..... کون ہو بھائی۔" اخلاق نے ہکلاتے ہوئے پُوچھا۔

سے چور کی طرف لپکا۔ ڈنڈے والا ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا کر چور کو مارنے ہی والا تھا کہ ابوّ چلاّئے۔ " ارے ارے رُک جاؤ۔ یہ چور نہیں — شیخ صاحب ہیں۔
"کیا !!!" ہم ایک ساتھ بولے۔
" ہاں بھئی ! — یہ میں ہوں۔ چور نے منہ سے کپڑا ہٹاتے ہوئے کہا۔ وہ واقعی ہمارے پڑوسی تھے — جن کے ہاں میں فون کرنے کے بارے میں کہہ چکا تھا۔
" دراصل ہماری اِستری اچانک خراب ہوگئی۔ بیگم صاحبہ صُبح میرے دفتر کے لیے کپڑوں پر استری کر رہی تھیں۔ اُنھوں نے مجھ سے کہا آپ کے ہاں سے اِستری لا دوں — میں یہاں آیا تو تم لوگوں کی باتیں میرے کان میں پڑیں اور میں دروازے پر ہی رُک کر ساری باتیں سننے لگا۔ پھر اچانک میں نے چور بننے کا پروگرام بنا لیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم جو کہہ رہے ہو، وہ کر بھی سکو گے یا نہیں۔ معلوم ہُوا کہ باتیں کرنے اور ان پر عمل کرنے میں بہت فرق ہے، پھر بھی آفتاب کی ہمّت کی داد دینی پڑتی ہے —" " لیکن ابوّ — آپ ان پر حملہ کرتے کرتے رُک کیوں گئے تھے اور آپ کو کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شیخ صاحب ہیں۔" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔
"جس وقت میں حملہ کرنے کے اِرادے سے اُچھلا، اسی وقت شیخ صاحب نے مجھے آنکھ سے اِشارہ کر دیا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ شیخ صاحب ہیں۔ میں انھیں یہ کپڑے پہنے پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔"
" اوہ۔ مگر دھم کی آواز کیسی تھی۔"
میں نے خود ہی اُچھل کر یہ آواز پیدا کی تھی تاکہ تم لوگ پہلے ہی خوفزدہ ہو جاؤ۔" شیخ صاحب نے مسکراتے ہوئے بتایا۔
ابوّ اور شیخ صاحب آفتاب کو اُس کی جرأت کی داد دے رہے تھے اور ہم اپنی اپنی ڈینگیں مارنے پر کھسیانے ہو رہے تھے۔

تصویر

بہار کے سہانے موسم میں شام کے وقت جب گھر کے تمام لوگ سبزہ زار میں بیٹھ کر خوش گپیاں کر رہے تھے، عامر اپنے کمرے میں سکول کا کام کر رہا تھا۔ اُن کی اُستانی سکول میں جتنا بھی کام دیتیں، عامر اُسی شام تمام کام پُورا کر لیا کرتا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ عامر کا چھوٹا بھائی مُون پردہ اُٹھا کر دوڑتا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس نے فوراً کمرے کی بتّی جلائی اور دھڑ سے ٹی وی کا بٹن دبا دیا۔ ٹی وی پر بچّوں کا ایک پروگرام شروع ہو چکا تھا اور وہ اُس کا پسندیدہ پروگرام تھا۔ عامر نے ٹی وی کھُلتے دیکھ کر سخت غصیلی نظروں سے مُون کو دیکھا، پھر غُرّا کر کہا "بند کرو ٹی وی۔ تمھیں نظر نہیں آتا کہ میں سکول کا کام کر رہا ہُوں!"

"بچوں کا پروگرام آ رہا ہے نا!" مُون نے آہستگی سے کہا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ عامر اُس کا بڑا بھائی ہے اور ذرا غُصّے سے یا اُونچی آواز میں بات کرو تو پہلی فرصت میں دو چار طمانچے گالوں پر جڑ دینے کے بُرے مرض میں مبتلا ہے۔

"بند کرو — مَیں نے کہا ہے، فوراً بند کرو!" عامر نے چیخ کر کہا۔

"نہیں کروں گا — نہیں کروں گا۔ تمھیں کام کرنا ہے تو اُوپر کے کمرے میں جا کر کرو!" مُون نے ڈٹ کر جواب دیا۔

"تو میں خُود بند کر دُوں گا — کام چور! اپنا ہوم ورک تو کرتا نہیں اور مجھے بھی نہیں کرنے دیتا!" عامر نے اُٹھ کر ٹی وی بند کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مُون جو برابر ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، سخت برہم ہو کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور ایک مُکّا عامر کی کمر پر جما دیا۔

"گستاخ! تیری یہ ہمّت"۔ عامر نے گھُوم کر تین چار تھپّڑ مُون کے رسید کر دیے۔

"تُو نے کیوں ٹی وی بند کیا" مون اور عامر دونوں گتھّم گتھّا ہو گئے۔ اُن کے ہاتھ پاؤں خوب تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور وہ اپنے منہ سے اَوٹ پٹانگ بھی بکتے جاتے تھے۔

امّی نے جو باہر کچھ عجیب و غریب آوازیں سُنیں تو وہ بھاگی ہُوئی آئیں۔ دونوں سے وجہ پُوچھی اور اُنھیں ایک دُوسرے سے الگ کرنے کے لیے کبھی ایک کا ہاتھ پکڑتیں۔ کبھی دُوسرے کا کندھا تھپکتیں مگر وہاں کون سُن رہا تھا۔ دونوں بھائیوں کے منہ سُرخ تھے۔ مکّے لگنے کی وجہ سے اور جسم کے مختلف حصّوں پر چوٹیں کھانے کی وجہ سے اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر رہی تھیں مگر جنون ایسا سوار تھا کہ کوئی ہار ماننے کو تیار ہی نہ تھا۔ لڑائی بند ہونے کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی تھی۔ تنگ آ کر امّی نے مُون کو ایک طرف دھکّا دیا اور ایک طمانچہ عامر کے منہ پر بھی لگا دیا۔

"کیا مصیبت ہے۔ بھائی بھائی ہو کر ایسی بدتمیزی سے لڑتے ہو۔ بدتمیز —!"

"پہلے مجھے اُس نے مارا!" مُون نے چیخ کر کہا۔

"نہیں پہلے اس نے مجھے مارا تھا۔" عامر کی آنکھوں میں چھوٹے بھائی سے مار

کھانے کے احساس سے شرمندگی کے آنسو بھر گئے۔" اس نے ٹی وی بند کیوں کیا؟" مُون نے دھاڑ کر کہا۔ اچانک اُسے ٹانگ پر گہری چوٹ کا احساس ہُوا جو اس لڑائی کے وقت میز سے ٹکرا گئی تھی۔ اُس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

امّی نے انصاف کے تقاضے کو مدِّ نظر رکھتے ہُوئے مُون کے آنسو خشک کرائے۔ پھر اُس کی ٹانگ دیکھی۔ چوٹ کوئی زیادہ نہیں تھی۔ "بیٹے! بُری بات ہے۔ اچھے بچّوں میں کبھی اس طرح لڑائی نہیں ہُوئی۔"

"ارے کیا ہُوا ــــ کیا ہُوا" عامر اور مون کے بڑے بھائی ناصر موٹر سائیکل کو کمرے کے ایک طرف رکھتے ہُوئے بولے۔ وہ ابھی باہر سے آئے تھے۔

"لڑائی ہو رہی تھی۔ یہ لوگ لڑنے سے باز نہیں آتے۔ اتنی مشکل سے الگ ہُوئے ہیں!" امّی نے بتایا۔

"ارے امّی ــــ آپ کو غلط فہمی ہُوئی ہوگی۔ یہ لوگ گلے مل رہے ہوں گے!" ناصر ہمیشہ اِسی قسم کے مذاق کرنے کے عادی تھے۔

یہ سُن کر عامر کو ہنسی آ گئی۔ مگر مُون کا موڈ سخت خراب تھا۔ اس لیے اُس نے سنجیدہ شکل بنا کر غُصّہ سے کہا "آپ کو کیا

ہو رہا ہے؟"

"یار بڑے زور سے پیٹ میں درد ہو رہا ہے!" ناصر بھائی نے شرارت سے اپنا پیٹ پکڑ کر جواب دیا۔ عامر تو اب قہقہہ لگانے لگا۔ امّی ان دونوں کو منہ دھلانے کے لیے غسل خانے کی طرف لے گئیں۔

اُسی رات اُن کے امّی اور پاپا کہیں گئے ہوئے تھے۔ سب لوگ مونگ پھلیاں کھا رہے تھے۔ مونگ پھلیاں مُون اور عامر دونوں کو پسند تھیں۔ مُون نے دیکھا کہ عامر نے مٹھی میں بہت ساری مونگ پھلیاں لے کر جیب میں ڈال لی ہیں۔

"واہ عامر! تم بے ایمانی کیوں کرتے ہو؟"

"تم مونگ پھلی کھاؤ۔ تم کو مجھ سے کیا مطلب؟" عامر نے اس کی توجہ مونگ پھلی کی پلیٹ کی طرف دلائی۔

"مگر تم نے چُرائی کیوں ہے؟"

"مَیں نے کب چُرائی ہے؟"

"مَیں نے خود دیکھا ہے۔ عامر! ہماری مس نے بتایا تھا کہ جھوٹ بولنا گناہ ہوتا ہے!"

"اِسی لیے تو مَیں تم سے کہتا ہوں کہ جھوٹ مت بولو۔ میں نے مونگ پھلیاں نہیں چُرائیں!"

"اچھا پھر جیب دکھاؤ نا؟" مومن نے بڑی ہوشیاری سے جواب دیا۔

"ارے ارے یہ کیا قِصّے شروع ہو گئے اس طرف؟" ناصر بھائی نے اُن دونوں کو باتیں کرتے دیکھا تو کہا:

"شاید لڑائی ہونے والی ہے!" فرحت آپا نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"شاید نہیں یقیناً!" ڈولی نے کہا جو مُون اور عامر دونوں سے عمر میں بڑی تھیں۔

"ہو جائے لڑائی — جو جیتے گا، اُسے دو پیسے والی مٹھائی انعام میں ملے گی!" ناصر بھائی نے پھر مسکرا کر کہا۔

"شاباش — کرو لڑائی۔ بھئی لڑنا تو بڑی اچھّی چیز ہے۔ ہم خود جب چھوٹے تھے تو خُوب لڑا کرتے تھے!" فرحت آپا بولیں۔

"اچھا مُون — تیار رہنا۔ اب کے جب تم لوگ لڑوگے تو میں تمھاری تصویر کھینچ لوں گا — ٹھیک ہے!" ناصر بھائی نے مُون سے کہا۔ مُون نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ڈولی نے کہا: "جب لڑنے کا ارادہ ہو تو پہلے مُنہ ہاتھ دھو کر بال سنوارنا، کپڑے اِستری کر کے پہننا، پھر لڑنا تاکہ تصویر اچھی آئے!"

"اور پہلے سے ناصر بھائی کو بتا دینا کہ اب آ جائیں، ہم لڑنا شروع کر رہے ہیں۔ آ کر تصویر کھینچ لیں!" بے جی نے کہا۔

"میں کیمرہ میں فلم بھر کر تیار رکھوں گا — اچھا!" ناصر بھائی نے کہا۔

دراصل ناصر بھائی کو تصویر کھینچنے کا بہت شوق تھا اور وہ بہت اچھی تصاویر کھینچتے تھے۔ اُن کے پاس ایک قیمتی کیمرہ تھا۔ گھر کے سب لوگوں کی تصویریں اُنھوں نے ایک بڑے البم میں سجا رکھی تھیں۔ مُون اور آمر چونکہ دونوں بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے، اس لیے انھیں تصویر کھنچوانے کا شوق بھی سب سے زیادہ تھا۔ بلکہ جب بھی ناصر بھائی کیمرہ لے کر بچّوں کو بُلاتے، یہ دونوں ضد شروع کر دیتے۔ "پہلے ہماری تصویر کھینچیے۔ ہماری تصویر کھینچیے!" اب تو سب لوگوں نے مذاق میں کہا تھا کہ لڑائی کرتے ہوئے اُن دونوں کی تصویر اتاری جائے گی۔

اتّفاق کی بات ہے کہ اگلے دن دوپہر کو ناصر بھائی دفتر سے واپس ہوئے تو کیمرے کی فلم بھی لے کر آئے۔ امّی کام کاج سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹی تھیں۔ عامر اور مُون دونوں ضد کرنے لگے کہ وہ امّی کے پاس لیٹیں گے۔ مُون کہنے لگے کہ وہ ہمیشہ امّی کے پاس سوتے ہیں، اس لیے اس وقت بھی وہ امّی کے پاس سوئیں گے۔ عامر نے کہا "میں یہیں لیٹوں گا۔ میری مرضی!" یہی لڑائی کی ابتدا تھی۔ کچھ ہی دیر میں دونوں بھائی ایک دُوسرے پر ٹوٹے" اور لاتوں کی بارش کرنے لگے۔ مار دھاڑ کی خبر سُن کر ڈولی، بے بی اور فرحت آپا تینوں بھاگی آئیں۔ امّی کی بھی آنکھ کھُل گئی، وہ جلدی سے اُٹھ کر بیچ بچاؤ کرانے لگیں۔ ناصر بھائی جو کل مذاق میں تصویر کھینچنے کے لیے کہہ رہے تھے، جلدی سے کیمرہ اُٹھا کر تصویر لینے کے لیے دوڑے۔

"لو بھئی! سچ مچ تصویر کھنچ رہی ہے!" ڈولی نے چیخ کر کہا۔

"تُو چور ہے!" مُون غصّے میں آکر بولے۔ جب غصّہ آتا تھا تو وہ ہمیشہ تُو پر اُتر آتے تھے۔

"تُو خود چور ہے۔ مجھے کہتا ہے — لگا دوں گا ایک ہاتھ؟" عامر نے غصّہ سے کہا۔

"لگا کے دیکھو — آیا بڑا — میں نہیں دُوں گا چار مُکّے!" مُون نے تڑاخ سے جواب دیا۔

"مزہ چکھا دوں گا — تو چھوٹا ہے مجھ سے!" عامر بھی دھاڑے۔

اور فوراً ہی ایک دُوسرے پر پل پڑے۔
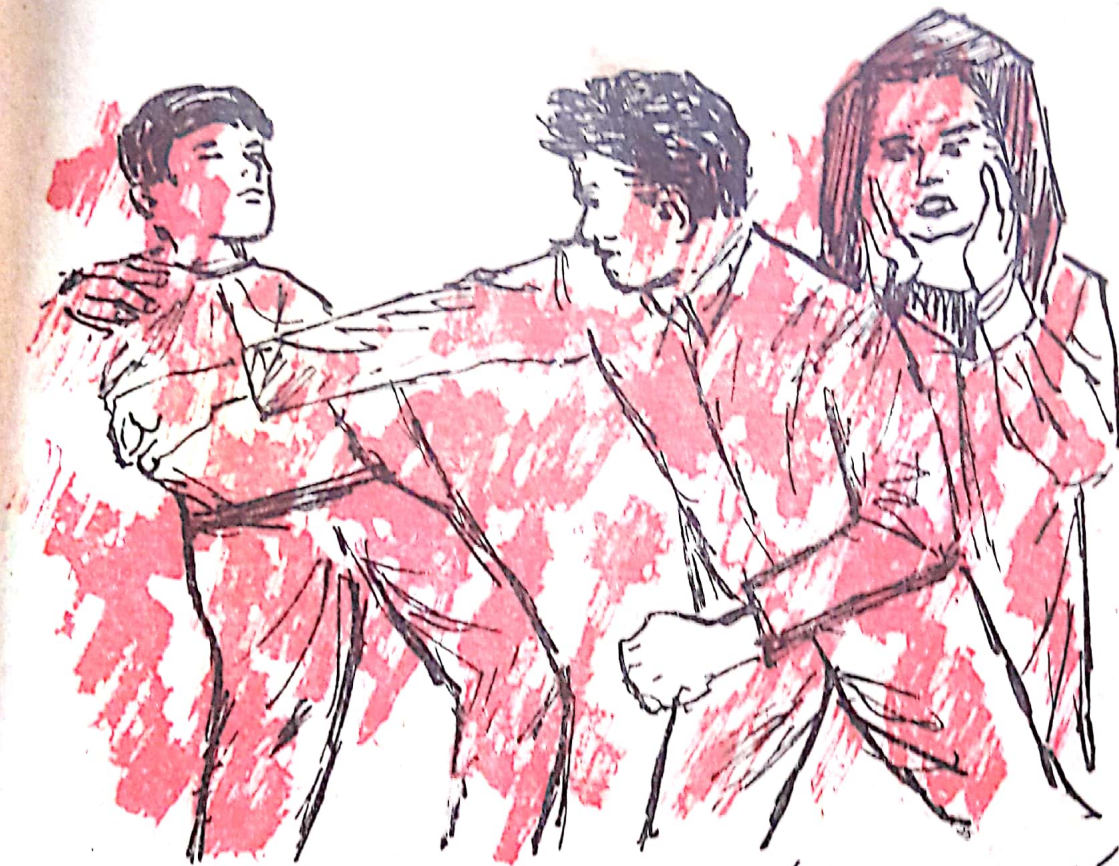
"کیا ہو رہا ہے۔ تم لوگ تو واقعی لڑنے لگے!" ڈولی نے حیرت سے کہا

"بڑی بات ہے۔ چلو ہٹو — دونوں الگ ہو جاؤ!" فرحت آپا نے آگے بڑھ کر دونوں کو ہٹایا۔

"گلے مل رہے ہیں۔ دونوں بھائی ایک دُوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ملنے دو گلے!" ناصر بھائی نے پھر شرارت سے کہا، فرحت آپا نے ہنستے ہوئے دونوں کو الگ کیا۔

تعلیم و تربیت اکتوبر ۱۹۷۷ء

"کتنی بار منع کیا ہے کہ تم لوگ کچھ تمیز سیکھ لو۔ یہ بُرے لڑکوں کی باتیں ہیں۔ تمھاری ممی تمھاری ایسی مرمّت کریں گی کہ یاد کرو گے۔ میں کل ہی اُن سے جا کر تمھاری شکایت کروں گی کہ گھر میں یہ لوگ ہر وقت لڑتے رہتے ہیں!"

عامر اور مُون الگ الگ بیٹھ کر اپنی چوٹوں کو سہلانے لگے۔

"اب اگر مَیں نے کسی کو لڑتے دیکھا تو ایسی پٹائی کروں گی کہ یاد کرو گے۔ بدتمیز ۔۔ گدھے کہیں کے!" آپا نے چیخ کر کہا۔

"انھیں کھانا نہیں ملے گا۔ بدتمیزی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر ابھی اتی ہوتیں تو تمھاری دُرگت بن جاتی!" ڈولی نے دھمکی دی۔

"یہ کن بدتمیز لڑکوں کے ساتھ رہتے ہو جو ہر وقت غصّہ ناک پر دھرا رہتا ہے اور ایک دُوسرے سے لڑنے کو تیار رہتے ہو؟"

آپا نے پوچھا۔

"اگر اب لڑے تو گھر سے باہر نکال دیں گے۔ سمجھے تم!" ڈولی نے پھر ڈرایا۔

"توبہ! عامر تم لڑتے ہوئے جب ایک دُوسرے گُتھم گُتھا ہوتے ہو تو ایسے بُرے لگتے ہو کہ بس ۔۔ اگر آئینہ دیکھ لو نا تو کبھی بھی نہ لڑا کرو!" بے بی جو دُور بیٹھی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں، مزے مزے سے بولی۔

"آپ کو کیا مطلب؟ مُون غصّے سے بولا۔

"آپ سے کون بات کر رہا ہے!" عامر نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔

"عامر بھائی! ایسا کریں کہ جب یہ دونوں لڑیں آپ ان کی تصویر کھینچ لیں!"

بے بی نے نئی تجویز پیش کی۔

"ہاں! وہ تصویر ہم لوگ فریم کرا کے ڈرائنگ روم میں سجا دیں گے!" ڈولی بولیں۔

"تاکہ سب آنے والے دیکھیں!" فرحت آپا نے کہا۔

"خوب مزہ آئے گا۔ جو بھی مہمان آئے گا، سوچے گا یہ کتنے بدتمیز بچّے ہیں!"

بے بی نے شرم دلائی۔

عامر منہ بنا کر وہاں سے اُٹھ گئے اور مُون بستر میں دبک گئے۔

"توبہ — حد کر دی۔ ان پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہُوا!" آپا بولیں۔
"کھینچ لیں بھائی ان کی تصویر — میں اخبار میں بھیج دوں گی" بے بی نے کہا۔
"اس کے نیچے لکھ دینا" دو لڑاکا بھائی!" ڈولی نے کہا
"نہیں! دو جنگجو لڑکے!" زیادہ بہتر رہے گا۔" بے بی نے مشورہ دیا۔
ناصر بھائی کو کیمرہ سنبھالتے دیکھ کر امّی نے دونوں بچّوں کو پھر لڑائی بند کرنے کا حکم دیا۔
"دیکھو! ناصر بھائی تصویر لے لیں گے۔ کیسی بُری بات ہے۔ سب لوگ مذاق اڑائیں گے!" امّی نے کہا۔ جب ناصر بھائی کیمرہ آنکھ کے سامنے کر کے تھوڑا سا آگے پیچھے ہو کر اُن دونوں کی تصویر لینے لگے تو عامر نے سوچا۔ واہ ایسی بُری تصویریں کیوں کھنچواؤں؟ مجھے کوئی مذاق اُڑوانا ہے؟"
"ناصر بھائی تو سچ مچ ہی کیمرہ لے آئے — جھگڑتے اور لڑتے ہوئے کیسی بُری تصویر آئے گی — بیڑہ غرق اُس کا جو لڑتے ہُوئے تصویر کھنچوائے!" اُس وقت کہ جب عامر نے اُس کی ٹانگ کے گرد اپنی ٹانگ اڑا کے اُسے نیچے گرایا ہُوا تھا اور اُس کی کمر پر مکّے رسید کر رہا تھا، مُون نے جلدی سے عامر کے کان میں چپکے سے کچھ کہا۔ "چلو ٹھیک ہے!
عامر نے فوراً اپنی ٹانگ سیدھی کی۔ اپنا بازو مُون کے کندھے پر رکھتے ہُوئے دوسرے ہاتھ سے اپنا کالر درست کر کے بال سنوارے۔ مُون نے بھی فوراً دونوں ہاتھوں سے سر کے بال ٹھیک کیے اور ایک بازو عامر کے گلے میں ڈالا۔ اور ناصر بھائی کے کیمرے کے عدسے کے ذریعے سامنے کا منظر دیکھا جہاں دونوں بھائی — تصویریں کھنچوانے کے شوقین بھائی، لڑائی جھگڑا بھول کر، اپنی چوٹوں کو بُھلا کر، تھپیڑوں، لاتوں اور مکّوں کی مار کو پس پشت ڈال کر ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے مُسکراتے ہُوئے کیمرے کی طرف مُنہ کیے کھڑے تھے اور اُن کے نزدیک بیٹھی ہُوئی امّی اور فرحت آپا ڈولی اور بے بی کے ساتھ زور زور سے ہنس رہی تھیں۔ کیسے چالاک بچّے ہیں!" "واہ بھئی — کمال کر دیا!"
"ان کی لڑائی ختم کرنے کا یہ طریقہ بہت اچھا ہے!"
"ناصر بھائی کا کیمرہ زندہ باد!" تصویر کھینچنے کے بعد سب نے نعرہ لگایا اور اُن میں مُون اور عامر بھی شامل تھے۔

پروفیسر صاحب نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں باہر آیا تو دیکھا کہ میرا عزیز دوست غیور احمد جو آج کل پی۔ ایم۔ اے (پاکستان ملٹری اکیڈمی) میں ٹریننگ حاصل کر رہا ہے، وہ کھڑا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے بہت خُوشی ہُوئی۔ ہم نے اپنے دوسرے دوستوں اقبال ظفر اور فرخ عباس کو ساتھ لیا اور کینٹین میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں چائے پیتے اور گپیں مارتے رہے۔ غیور نے مجھے بتایا کہ وہ چار تاریخ کو واپس جا رہا ہے۔ میں نے ایبٹ آباد پہلے بھی دیکھا ہے لیکن پی۔ ایم۔ اے اور کاکول وغیرہ نہیں دیکھا تھا۔ میرے دل میں ایک عرصے سے خواہش تھی کہ یہ دونوں جگہیں دیکھوں۔ بہرحال باتوں باتوں میں میرا غیور کے ساتھ پروگرام بن گیا اور یہ طے پایا کہ چار تاریخ کو ہم لوگ صُبح صُبح لاہور سے چل پڑیں گے۔ میرا پھوپھی زاد بھائی عبدالغفور ناصر میرے ساتھ ہی پڑھتا ہے۔ اُس سے جب میں نے اپنے پروگرام کا ذکر کیا تو وہ بھی میرے ساتھ تیار ہو گیا میں نے سوچا کہ کیوں نہ دو تین لڑکے اور ہو جائیں تو ہم لوگ گروپ سا بنا کر چلیں۔

میرا ایک دوست سلیم میرے گھر کے پاس ہی رہتا ہے۔ میں اُس کے پاس گیا۔ اُسے میں نے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو وہ بھی تیار ہو گیا۔ اُس کے ساتھ اُس کا ایک دوست محمود بھی تیار ہو گیا۔ غیور کا ایک کزن فیاض بھی میرے گھر کے نزدیک ہی رہتا ہے۔ مَیں نے اس سے ذکر کیا تو اُس نے بھی ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔ بعد میں میرے تایا زاد بھائی اکرام اور میرے ایک ہمسائے لطیف نے بھی ساتھ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یوں کُل آٹھ لڑکوں کا ایک گروپ ہو گیا۔ اب اتفاق ایسا ہُوا کہ سلیم کے چچا جان چار تاریخ کو دوبئی جا رہے تھے اور اُن کو رات گیارہ بجے کی فلائٹ سے جانا تھا۔ اب سلیم نے کہا کہ "بھیا! اگر پانچ تاریخ کو چلتے ہو تو میں چلوں گا، ورنہ آئی ایم سوری"

مَیں نے باقی لڑکوں سے پُوچھا تو فیاض، اکرام اور لطیف نے ساتھ جانے سے معذوری ظاہر کر دی۔ البتہ محمود اور غفور نے رائے دی کہ پانچ تاریخ ہی کو چلو۔ میں نے غیور کو ساری بات بتائی تو غیور کہنے لگا، "یار! تم لوگ پانچ ہی کو

آجانا۔ میں سچار کو چلا جاؤں گا اور پھر وہاں تم مجھے مِل لینا۔ یوں غیور تو چار تاریخ کو چلا گیا اور ہم لوگ پانچ تاریخ کو صبح پانچ بجے جی۔ٹی۔ایس (گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس) کے ڈپو پر موجود تھے۔ یہاں ایک بس جو سیدھی ایبٹ آباد جا رہی تھی، کھڑی تھی۔ ہم اُس میں بیٹھ گئے۔ کوئی آدھا گھنٹہ ہم اُس میں بیٹھے رہے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ بس خراب ہے اور یہ ٹھیک ہو کر دس بجے چلے گی۔

ہمیں اور دُوسری سواریوں کو غصّہ تو بہت آیا کہ عجیب ہے پہلے تو کہتے تھے کہ "جائے گی" اور اب کہتے ہیں "خراب ہے"۔ بہرحال سامان اُٹھایا اور لاہور سے پنڈی جانے والی بس میں بیٹھ گئے۔ جو تھوڑی دیر کے بعد ہی چل پڑی۔ اِدھر بس چلی اور اُدھر ہم نے ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر بھی بہت ہنس مُکھ اور زِندہ دل نِکلے۔ ہم سارا راستہ گانے سنتے رہے اور ڈرائیور سے گپیں لگاتے رہے۔ جب یہ بس گجرات پہنچی تو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی اور جہلم کے آس پاس بارش نے اپنے رنگ دکھائے۔ راستے میں ایک ٹرک اور بس اُلٹی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے یہ حادثے تیز رفتاری ہی کی وجہ سے پیش آئے ہوں گے۔

کوئی ساڑھے بارہ بجے کے قریب ہماری بس اسلام آباد کی خوب صورت سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی پنڈی کے ڈپو پر پہنچ چکی تھی۔ یہاں ہم اُترنے لگے تو ڈرائیور زور لگانے لگا کہ چائے پی کر جانا۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر وہاں اُتر کر ایک ہوٹل ڈھونڈا، جہاں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ پھر پنڈی سے ایبٹ آباد کے ٹکٹ لے کر بس میں بیٹھ گئے۔ یہ بس جو پنڈی سے ایبٹ آباد جا رہی تھی، اسے ہم نے دیکھا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ انشاءاللہ ہم کل پرسوں تک ایبٹ آباد پہنچ جائیں گے۔ بس کی حالت بہت خراب تھی لیکن جب وہ چلی تو اُس نے کئی بسوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ہم نے اس بس کو "بری صورت" "نیک سیرت" کا خطاب دیا ہم راستے کے منظروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کوئی سوا چار بجے کے قریب ایبٹ آباد پہنچ گئے۔ میں جب پہلے ایبٹ آباد گیا تھا تو اُس وقت ایبٹ آباد کی سڑک بہت خطرناک تھی۔ اب تو ایبٹ آباد کی سڑک بہت کھلی

اور بعض جگہوں پر دو رویہ بن چکی ہے۔ اس لیے ڈرائیور ان سڑکوں پر بس کو ایسے بھگا رہا تھا، جیسے لاہور سے گوجرانوالہ تک ڈرائیور آنکھیں بند کرکے بس بھگاتے ہیں۔ ایبٹ آباد پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں کاکول پی۔ایم۔اے اور جونیئر کیڈٹ بٹالین کے کیڈٹوں سے بازار بھرے ہوئے تھے جس طرف نظر اٹھتی تھی، ایک جیسے قدم اٹھاتے ہوئے کیڈٹ نظر آرہے تھے۔ صاف ستھری سفید قمیصیں کالی یا نیلی پتلونیں اور سرخ اور نیلی ٹائیاں باندھے ہوئے یہ نوجوان کیڈٹ بہت خوب صورت لگ رہے تھے حالانکہ ہم نے لاہور سے ایبٹ آباد تک مسلسل سفر کیا تھا مگر ہمیں ذرا سی بھی تھکاوٹ نہیں تھی۔ ہم نے اپنا سامان گھر میں رکھا اور نہا دھو کر کپڑے پہن کر اسی وقت ایبٹ آباد کے بازاروں میں گھومنا شروع کر دیا۔ میری نظریں چاروں طرف غیور کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید غیور بھی کہیں سیر کر رہا ہو لیکن غیور مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ ہم کافی دیر تک ادھر ادھر گھومتے رہے۔ پھر ہم نے ایک ہوٹل میں جاکر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد فلم دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ یہاں ہمیں ایک شخص نے بتایا کہ "جی! یہاں کا سب سے بہترین سینما تاج محل ہے"۔ وہاں اردو فلم "آئینہ" لگی تھی۔ ہم نے کہا: چلو یہی فلم دیکھتے ہیں۔ جب ہم سینما ہال میں پہنچے اور بکنگ پر جاکر ٹکٹ لیے تو ہماری جرأت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب بکنگ کلرک نے ہم سے گیلری کے ٹکٹ کے صرف ساڑھے تین روپے مانگے بہرحال جب ہم ٹکٹ لے کر گیلری میں پہنچے تو ہم نے کہا "واقعی گیلری کے ساڑھے تین روپے بالکل ٹھیک تھے"! کیوں کہ سینما ایسا تھا کہ اس قسم کا سینما ہم نے لاہور میں نہیں دیکھا نہایت ہی گھٹیا حالت ٹوٹی پھوٹی سیٹیں، ایئر کنڈیشنر غائب، سکرین پر دھبے اور اوپر سے خان بھائیوں نے سگریٹ کا دھواں پھیلا رکھا تھا۔

ایک اور چیز جو ایبٹ آباد میں بہت ناقص اور گھٹیا ہے، وہ مشروبات کی بوتلیں ہیں۔ آر۔سی پیپسی اور بینز کا تو شاید وہاں نام لوگ نہیں جانتے، صرف ٹاپس، سیون اپ اور کوکا کولا نظر آئیں۔ کوکا کولا بھی چھوٹے سائز کا اور اوپر

سے جعلی، گویا یک نہ شُد دو شُد! بوتل پیتے تھے تو مُنہ میں جھاگ سی جمع ہوتی تھی۔ سیون اَپ پی تو اُس کا ذائقہ بھی خاص نہ تھا۔ بہرحال یہ بوتلیں پیاس کو کم کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی کا کام ضرور دے گئیں۔

رات کو ایک بجے کے قریب سوئے تو پھر دُوسرے دن اُٹھے بھی نو بجے صبح اُٹھ کر نہائے، کپڑے تبدیل کیے اور بازار میں آ کر ناشتہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ ہم لوگ ایبٹ آباد میں سری پائے ڈھونڈتے تھے۔ لیکن وہاں سری پائے تو کہیں رہے حلوہ پوری بڑی مشکل سے ملے کافی دیر ڈھونڈنے کے بعد ایک حلوہ پوری کی دوکان نظر آئی وہاں بیٹھ کر بیرے کو حلوہ پوری لانے کا آرڈر دیا اور پھر جو بیرے کا انتظار کرنا شروع کیا، بیرا ہی کہیں سو گیا تھا۔ بیرے کی تلاش میں نکلے تو پتا چلا کہ جس جگہ پوریاں تلی جاتی ہیں، وہاں سے مقامی لوگ جلدی جلدی خود ہی پوریاں اُٹھا کر لے جاتے ہیں اور بیرا صاحب اِن مقامی لوگوں کے چہرے ہی تکتا رہتا ہے بہرحال یہ صُورتِ حال دیکھ کر ہم نے بھی ہمت کی اور پُوریوں کو اغوا کیا۔ تب کہیں جا کر ہمیں حلوہ پوری نصیب ہُوئے۔
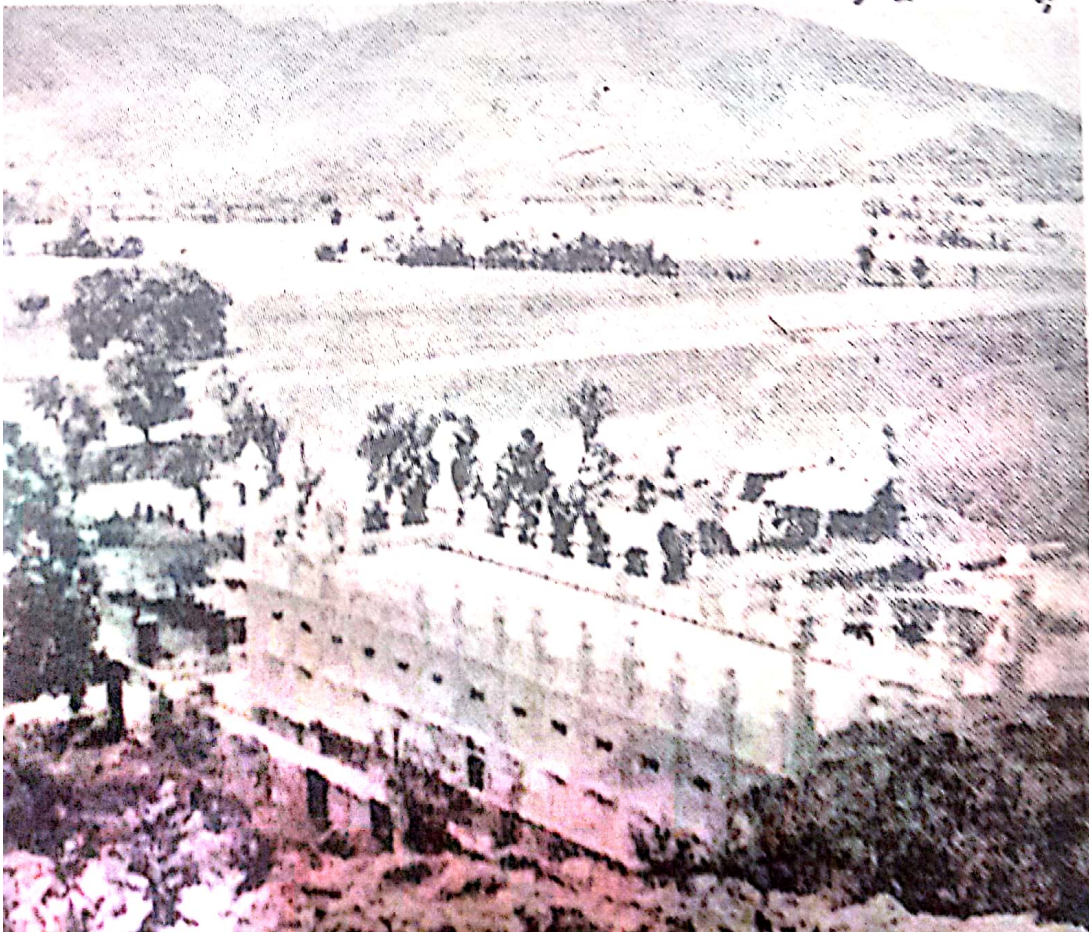
ایبٹ آباد کی مشہُور الیاسی مسجد

ناشتہ کرنے کے بعد ہم نے ویگن پکڑی (وہاں ٹیکسی عام کار کی بجائے سوزوکی ویگن کی چلتی ہے) اُسے ہم نے الیاسیہ مسجد چلنے کو کہا الیاسیہ مسجد پہنچے تو وہاں ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے خوب صورت مقامی بچّے پانی کے تالابوں میں نہا رہے تھے۔

مسجد کے پاس ہی ایک اُونچا سا پتھروں کا پہاڑ ہے۔ ہم نے ارادہ کیا کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر جانا ہے۔ بہر حال چل پڑے۔ تھوڑا سا ہی چڑھنے کے بعد سانس پھُول گئی، سانس لیا اور پھر اُوپر چل پڑے۔ جب نصف سے کچھ اُونچے پہنچے تو ایک جگہ بہت سے پٹھان کھڑے تھے۔ انھوں نے ہمیں کہا "برادر! ذرا اس طرف آجاؤ گا۔" ہم اُن کے پاس جاکر کھڑے ہو گئے ایک منٹ کے وقفے کے اندر ایک زور دار دھماکہ ہوُا اور چٹانوں کے ٹکڑے دُور دُور تک پھیل گئے، ہم نے اُن سے دریافت کیا "خان صاحب! یہ کیا تھا؟" وہ بتانے لگے کہ اس جگہ پر اُنھیں مکان بنانے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ چٹانوں سے جگہ صاف کر رہے تھے۔ ہم نے اُن سے پُوچھا کہ آپ لوگ یہ کام کب سے کر رہے ہیں۔ وہ کہنے لگے "کہ جی ہم دو سال سے ابھی صرف چٹانیں توڑنے کا کام کر رہے ہیں جب یہ جگہ ہموار ہو جائے گی تو تب یہاں مکان بنائیں گے۔" ہم نے اُن لوگوں کی تصویریں اُتاریں اور اُن سے وعدہ کیا کہ ہم اُنھیں تصویریں بھیجیں گے لیکن بد قسمتی سے وہ ریل جس میں اُن کی تصویریں تھیں، ہمارے ایک دوست سلیم سے ضائع ہو گئی جس کا ہمیں بہت افسوس ہوُا کیوں کہ اتنی اُونچی پہاڑی پر ہم صرف تصویریں اُتارنے کے لیے چڑھے تھے۔

جب ہم پہاڑی کے اُوپر پہنچے تو یہاں آکر بہت سکون محسوس ہوُا۔ نیچے لوگ ہمیں کیڑے مکوڑوں کی طرح نظر آ رہے تھے ایک پہاڑ جس پر ہم تھے اور ارد گرد دوسرے اُس سے بھی اُونچے پہاڑ تھے جنھیں دیکھ کر اللّٰہ تعالیٰ کی عظمت کا خیال آتا تھا۔ انسان ایسی جگہ پر آکر سوچتا ہے کہ اتنے بلند و بالا پہاڑ اور گہری وادیاں بنانے والی ہستی آخر کون ہے؟ اور خُدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اُس نے انسان

کو اشرف المخلوقات بنایا اور ہر چیز سر کرنے کی ہمت دی۔
بعد میں ہم نے نیچے اترنا شروع کیا۔ نیچے آ کر ہم نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر پی۔ایم۔اے (پاکستان ملٹری اکیڈمی) کی طرف چل پڑے جو الباسیہ مسجد سے قریب ہی ہے۔ جب ہم پی۔ایم۔اے کے مین گیٹ پر پہنچے تو وہاں ایک چیکنگ پوسٹ تھی۔ وہاں ایک صوبیدار صاحب بیٹھے تھے ہم نے جا کر انھیں سلام کیا۔ انھوں نے نہایت شیریں لہجے میں سلام کا جواب دیا اور ہمارے ساتھ بہت اپنائیت سے پیش آئے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم لاہور سے آئے ہیں اور غفور کو ملنا ہے۔ وہ کہنے لگے "بھتیا! کیڈٹوں سے سویلین لوگ صرف جمعرات اور جمعے ہی کو مل سکتے ہیں۔ آگے پیچھے اُن سے ملنے کی اجازت نہیں ہے اور ساتھ آپ کو جس کیڈٹ سے ملنا ہے، وہ یہاں نہیں ہے وہ جونیر کیڈٹ بٹالین میں ہیں اور وہ جگہ یہاں سے نزدیک ہی ہے۔ آپ لوگ وہاں پیدل بھی جا سکتے ہیں۔
ہم اُنھیں سلام کر کے جونیر کیڈٹ بٹالین کی طرف چل دیے اَب جو ہم نے چلنا شروع کیا تو پھر کیڈٹ بٹالین ہی دُور ہوتی گئی جس سے پُوچھیں، وہ یہی کہے جی بس نزدیک ہی ہے۔ ہم نے راستے میں سیبوں کے بہت سے باغات دیکھے۔ راستے میں ایک میجر صاحب کی کوٹھی تھی، وہاں ایک لڑکی سیب توڑ کر چھوٹے بچّوں کو دے رہی تھی۔ ہم وہاں سے گزرتے ہُوئے سب کوٹھیوں کی نیم پلیٹیں پڑھتے جا رہے تھے جب ہم وہاں نیم پلیٹ پڑھنے کے لیے رُکے تو وہ لڑکی بولی "اگر آپ لوگوں کو سیب کھانے ہوں تو اتار لیجیے۔" ہم نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور ہمارے ساتھیوں غفور اور محمود نے کافی سارے سیب اتار لیے جو وہ سارا راستہ کھاتے گئے جب ہم جونیئر کیڈٹ بٹالین کے گیٹ پر پہنچے تو وہاں بھی گیٹ پر ایک چیکنگ پوسٹ تھی۔ وہاں ہمیں ایک فوجی نے روک لیا اور کہنے لگا "آپ لوگ کیڈٹ کو نہیں مل سکتے کیوں کہ سویلین لوگوں کو جمعرات اور جمعہ کے علاوہ اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔" میں نے اُنھیں بتایا کہ "میں لاہور سے ایبٹ آباد صرف اس لیے آیا ہوں کہ یہ جگہ دیکھوں اور اپنے دوست سے ملوں اور آپ فرما رہے ہیں کہ وہ ہم سے نہیں

میں نے سلیم، غفور اور محمود کو کینٹین میں بٹھایا اور خود اُس آفیسر کے ساتھ انکوائری آفس میں چلا گیا کیوں کہ اس وقت غفور کا آخری پیریڈ لگا ہُوا تھا وہاں ایک حوالدار میجر صاحب بیٹھے تھے۔ وہ بڑی ہمدردی اور اپنائیت سے پیش آئے۔ اُنھوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی اور کہنے لگے "ابھی پیریڈ ختم ہونا ہے تو آپ کی ملاقات کروا دی جائے گی۔" میں وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اُس کمرے میں کئی آفیسر آئے۔ کسی آفیسر نے مجھے پہلے سلام کرنے کا موقع نہیں دیا بلکہ اس سے پہلے کہ میں انھیں سلام کرتا، وہ لوگ خود ہی آگے بڑھ کر مصافحہ کرتے ایسے جیسے کہ میں اُن کا کوئی نزدیکی رشتہ دار ہوں اور ہوں کیوں نہیں وہ فوجی جوان جرأتوں کے نشان اور ہماری پاک سرحدوں کے محافظ ہیں۔ وہ ہمارے بھائی ہیں۔ وہ لوگ ہماری خاطر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لیتے ہیں ہماری پاک فوج کا اخلاق بہت بلند ہے اور کسی بھی فوجی جوان سے مل کر اتنی خوشی ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ جتنی دیر میں اُن لوگوں کے درمیان بیٹھا رہا لحہ بھر کو بھی میں نے اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے بڑے بھائی میرے اِرد گرد بیٹھے ہیں اور میں یہ بات بالکل صحیح لکھ رہا ہوں کہ اُن لوگوں کے درمیان بیٹھ کر مجھے پہلی بار حقیقی مسرت ہوئی اور خوشی سے میرا کافی خون بڑھا کہ میں اپنے دیس کے رکھوالوں کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ اُن پاک جوانوں کے درمیان جن کے سینوں میں قرآن محفوظ ہیں جو اپنے پیارے وطن کی خاطر سر کٹانا جانتے ہیں اور جب بھی کوئی دشمن ناپاک ارادوں سے اس دھرتی کی جانب دیکھتا ہے تو وہ اس کا مُنہ توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

میں نے این۔ سی۔ سی (نیشنل کیڈٹ کور) کی ٹوپی پہن رکھی تھی صوبیدار میجر صاحب کہنے لگے "بیٹے! کیا آپ نے این۔ سی۔ سی جوائن کر رکھی ہے؟" میں نے کہا "جی ہاں۔" وہ کہنے لگے "بیٹے! آپ کون سی جماعت میں پڑھتے ہیں؟" میں نے کہا "میں الیف۔ اے کا طالب علم ہوں۔" وہ کہنے لگے "آپ ملٹری کیوں نہیں جوائن کر لیتے۔ آپ کی تعلیم، قد، جسم وغیرہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "دیکھیں انشا اللہ تعالیٰ الیف۔ اے کے بعد کوئی اِدھر کا پروگرام بناؤں گا۔" کہنے لگے "بھئی الیف اے کے بعد تو آپ پی۔ ایم۔ اے

ایک گاڑی مل گئی۔یہ گاڑی ایبٹ آباد سے راشن لے کر آئی تھی۔ہم اسی میں بیٹھ گئے۔سب کو خدا حافظ کہا اور چل پڑے کوئی پندرہ منٹ کے بعد ہم پھر ایبٹ آباد میں موجود تھے۔یہاں آکر ہم دوبارہ ایک اونچی سی پہاڑی پر چڑھ گئے کیوں کہ تصویریں اتارنی تھیں۔یہ پہاڑی پہلے والی پہاڑی سے بھی اونچی تھی۔اوپر

ٹریفک سے بھری سڑکوں پر پتنگیں پکڑنے کے لیے لڑکے بالے بھاگتے ہیں ہمیں ڈر ہی لگا رہتا تھا کہ کہیں یہ گر نہ جائیں لیکن وہ ہرنوں کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہوئے اِدھر سے اُدھر بھاگتے تھے۔ یہاں ہم نے بہت ہی خوب صورت بچے دیکھے۔ اگر ان بچوں کو چیتھڑے لگے کپڑوں کی بجائے صاف ستھرے سوٹ پہنا دیے جائیں تو وہ انگریزوں کے بچے کی طرح لگیں۔ ان علاقوں میں ہم نے غربت بہت دیکھی۔ اتنے اتنے پیارے معصوم پھول جیسے بچے بھیک مانگتے اور کاروبار کرتے ہیں جن کی عمریں ابھی کھیلنے کودنے کی ہیں۔ اُن بچوں کو ایسی حالت میں دیکھ کر دل کو دھچکا لگتا تھا۔ نیلی نیلی آنکھیں، سنہری بال اور گورے رنگ والے یہ بچے بہت ہی خوب صورت لگتے تھے اور جب ہم اُن سے کوئی بات کرنے لگتے تو وہ ہم کو دیکھ کر ہنستے (اُن کی ہنسی بھی بہت سادہ اور اصلی تھی جن شہروں میں ہم لوگ رہتے ہیں یہاں تو ہنسی بھی مصنوعی ہے) اور پھر بھاگ جاتے تھے میرے دل میں خیال آیا کہ کاش میرے بس میں کچھ ہوتا تو ان بچوں کی غربت دُور کرنے کا کوئی طریقہ سوچتا۔

بعد میں آکر آرام کیا، کھانا وغیرہ کھایا اور پھر آوارہ گردی کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ رات آئی اور نیند لائی۔ کہتے ہیں نیند تو سولی پہ بھی آ جاتی ہے۔ ہمیں تو پھر آرام دہ بستروں پر سونا تھا۔ ہم جلد ہی سو گئے کیوں کہ دوسرے دن پشاور جانا تھا۔ دوسرے دن صبح اٹھ کر ناشتہ وغیرہ کیا اور پھر دس بجے کے قریب ہم پشاور والی بس میں بیٹھے تھے۔

ہمارے بیٹھنے کے کوئی بیس منٹ بعد بس چل پڑی۔ ایبٹ آباد سے پشاور کا راستہ بھی اچھا ہے۔ لیکن کئی جگہوں پر خطرناک بھی ہے۔ ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ ایک لمبی سی شیور لیٹ گاڑی پہاڑی سے ٹکرا کر چکنا چور ہوئی تھی۔ اُس سے کوئی میل پرے ایک بڑا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں بس آدھی وادی کی طرف جھکی ہوئی تھی اور آدھی سڑک پہ تھی۔ یہ حادثات دیکھے تو تیز رفتاری کا انجام آنکھوں کے سامنے آیا۔ ہمارا خیال تھا کہ پشاور موسم خوشگوار ہوگا لیکن جب پشاور پہنچے تو پتا

کے ساتھ کافی دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ انھوں نے فلم کے لیے زور لگایا لیکن ہمارا موڈ نہیں تھا۔ وہ کہنے لگے چلو پشاور کی سیر ہی کریں۔ ہم سب ہوٹل سے باہر آئے تو دیکھا کہ وہ ایک تانگہ لے کر آئے تھے۔ تانگے کو کوچوان نے کسی دلہن کی طرح سجایا ہوا تھا اور گھوڑا بھی بہت جاندار تھا۔ اُس وقت پشاور کی خالی سڑکوں پر تانگے کی سیر کا بہت لطف آیا۔ صدر گئے وہاں سے کھایا پیا۔ دوپہر کوئی بارہ بجے کے قریب آ کر سوئے۔ رات گزری، دن آیا۔ ناشتہ اپنے ساتھ لیا۔ مشہور عام ملائی کا ناشتہ کیا ناشتہ کر کے ہمارا باڑے جانے کا پروگرام تھا ہمیں وہاں سے کچھ کپڑا اور چیزیں خریدنی تھیں۔ باڑہ گئے۔ سارا دن چیزیں خریدنے اور باڑہ دیکھنے میں صرف ہو گیا۔ کوئی ساڑھے چار بجے کے قریب وہاں سے واپس ہوئے۔ پشاور کے بازاروں میں گھومے پھرے اور پھر رات پشاور میں آخری کھانا کھایا دوسرے دن چھ بجے کے قریب ہم لوگ ریلوے سٹیشن پر موجود تھے۔ پونے سات بجے ریل کار جانی تھی۔ اس میں ہماری سیٹیں تھیں تیز رو پونے سات بجے چلی اور پھر ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ سارا راستہ نظارے دیکھتے رہے۔ پنڈی سے بارش ہوئی اور پھر لاہور تک ہم نے بارش کو نہیں رکتے دیکھا ٹرین میں بھانت بھانت کی بولیاں سنتے، رنگ برنگ چہرے دیکھتے ہوئے آخر کار ہم پورے پونے سات بجے لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

یہاں کی بھئی! بات ہی اور ہے
غرض یہ کہ لاہور لاہور ہے
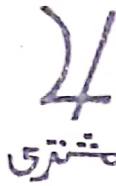
سورج اور اُسکا خاندان

کِسی زمانے میں اِنسانی ذہن کے لیے زمین ایک ایسی وسیع چیز تھی، جس کی وسعت کا اندازہ لگانا اُس کے لیے نا ممکن تھا۔ لیکن آج جب کہ سائنس ترقی کے موجودہ دَور سے گزر رہی ہے، انسان چاند پر پہنچ چُکا ہے اور مریخ پر اِنسان بردار خلائی جہاز بھیجنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں تو ہمیں کائنات (UNIVERSE) میں اپنی حیثیت اور اہمیت کا اندازہ ہُوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب ہم کائنات کی لا محدود وسعتوں سے اپنی زمین کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ کائنات میں ہماری حیثیت ایک ذرّے کے برابر ہے۔ کائنات کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کائنات میں بے شمار کہکشائیں موجود

سورج کے گرد کس رفتار سے چکر کاٹتا ہے۔ جیسے عطارد جو سورج سے قریب ترین سیارہ ہے، سورج کے گرد ایک لاکھ دس ہزار (۱۱۰،۰۰۰) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگاتا ہے اور اس کا ایک سال زمینی دنوں کے مطابق صرف اٹھاسی دن کا ہوتا ہے۔ ہماری زمین سڑسٹھ ہزار (۶۷،۰۰۰) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کے گرد تین سو پینسٹھ دنوں میں ایک چکر پورا کرتی ہے۔ اسی لیے ہمارا سال ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے۔ جب کہ نظامِ شمسی کا سب سے آخری سیارہ پلوٹو سورج کے گرد دس ہزار (۱۰،۰۰۰) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگاتا ہے۔ اسے اپنا ایک چکر مکمل کرنے کے لیے زمینی دنوں کے حساب سے دو سو اڑتالیس (۲۴۸) سال درکار ہوتے ہیں۔

نظامِ شمسی کا ہر سیارہ اپنے اپنے مقررہ مدار میں چکر لگاتا ہے۔ مدار سے مُراد فضا میں وہ جگہ ہے جہاں وہ چکر لگاتا ہے۔ ان سیاروں کی وہ قوت انھیں مدار میں رکھتی ہے جو مرکز کی طرف مائل ہے جب کہ سُورج کی کشش کی وجہ سے یہ سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ اس حرکت کے علاوہ ہر سیارہ اپنے محور کے گرد بھی چکر لگاتا ہے۔ جس سے اس سیارے کے دن رات پیدا ہوتے ہیں۔

نظامِ شمسی میں ستارے ایک چوڑی پٹی کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں اور یہ پٹی مریخ سیارے سے لے کر مُشتری سیارے تک پھیلی ہوئی ہے۔ دُمدار تارے عموماً نظامِ شمسی کے سب سے دُور واقع مداروں میں ہوتے ہیں۔

مُشتری اور زُحل ——— گیس کے دیو

مُشتری اور زُحل نظامِ شمسی کے خُوب صُورت سیاروں میں سے ہیں۔ ان کے قطر ستاسی ہزار (۸۷،۰۰۰) اور بہتر ہزار (۷۲،۰۰۰) میل ہیں۔ جسامت کے لحاظ سے یہ دونوں سیارے تمام دیگر سیاروں سے ہلکے ہیں۔ زمین کی اوسط کثافت (پانی =۱) ۵٫۵ (پانچ اعشاریہ پانچ) جب کہ مشتری کی کثافت ۱٫۳۴ اور زحل کی ۰٫۶۸ ہے (جو ٹھیک پلاسٹک کے برابر ہے)

ماضی میں ماہرِ فلکیات کی رائے کے مطابق ان دونوں سیاروں کے نسبتاً کم وزن

ہیں جن میں سے زمین کے قریب ترین کہکشاں کو سفیڈ (SEPHEID) کہتے ہیں، زمین سے اُس کا فاصلہ تین سو (۳۰۰) نوری سالوں کے برابر ہے۔

نوری سال

(LIGHT YEAR) ایک سال میں روشنی جتنا فاصلہ طے کرتی ہے، اُسے نوری سال کہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار (۱۸۶،۰۰۰) میل فی سیکنڈ ہے۔ آپ حساب لگائیے کہ روشنی ایک سال میں کتنا فاصلہ طے کرتی ہے تو معلوم ہوگا کہ یہ فاصلہ اٹھاون کھرب، پینسٹھ ارب، اُنہتر کروڑ اور ساٹھ لاکھ میل کے برابر ہے۔

موجودہ تمام سائنسی ترقی کے باوجود ہماری کائناتی معلومات کے زیادہ تر حصے کا تعلق اپنے نظامِ شمسی سے ہے۔ اور بعض حالتوں میں تو ہم ابھی تک اپنے نظامِ شمسی کو بھی پوری طرح نہیں سمجھ پائے۔

نظامِ شمسی

(SOLAR SYSTEM) نظامِ شمسی کیا ہے؟ یہ کائنات کے ان لاکھوں نظاموں میں سے ایک چھوٹا سا نظام ہے، جس میں ایک ستارہ، نو سیارے اور اُن کے بتیس (۳۲) چاندوں کے علاوہ ہزاروں ستارے اور لاکھوں دُم دار تارے شامل ہیں۔ سورج جو اس نظام کا مرکز ہے، تمام سیاروں اور اپنے نظام کے دُوسرے اجسام کو کنٹرول کرتا ہے۔

ہم ان نو (۹) سیاروں کو ان کی جسامت اور کثافت کی وجہ سے دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے حصّے میں ہم ان چار سیّاروں کا ذکر کریں گے جو دیگر سیّاروں کے مقابلے میں سورج سے قریب تر ہیں اور جن میں ہماری زمین بھی شامل ہے۔ دُوسرے حصّے میں وہ چار بڑے سیّارے آئیں گے جو سورج سے پہلے چار سیّاروں کے مقابلے میں دُور تر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک سیّارہ پلوٹو ہے، مگر اس کے بارے میں ابھی معلومات نامکمل ہونے کی بناء پر اسے سیّاروں کی کسی جماعت میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

ان سیّاروں کا سُورج سے فاصلہ دیکھا جاتا ہے۔ یہ امر بھی توجہ کے قابل ہے کہ کسی سیّارے کا سال معلوم کرنے سے پہلے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ وہ سیّارہ

ہونے کی وجہ یہ ہے ان کی اندرونی فضا میں بے پناہ دباؤ کی وجہ سے ہائیڈروجن منجمد حالت میں موجود ہے دُوسری طرف کچھ اور ماہر فلکیات کی رائے ہے کہ اِن دونوں سیّاروں کی اندرُونی فضا چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن آج ماہر فلکیات جانتے ہیں کہ مشتری اور زحل کی فضا کثیف اور زہریلی ہائیڈروجن امونیا اور میتھین پر مشتمل ہے۔ یہ گیس دونوں سیّاروں میں سینکڑوں میل لمبے گہرے اور طوفانی بادلوں کی صُورت میں گردش کرتی رہتی ہے۔

ان دونوں سیاروں کی درجِ ذیل کچھ خصوصیات مشترک ہیں:

یہ دونوں سیّارے نہایت تیزی سے گردش کرتے ہیں۔ دونوں کی سطح کا درجۂ حرارت تقریباً دو سو (۲۰۰) ڈگری فارن ہیٹ مانا گیا ہے۔ دونوں سیّاروں کے بہت سے ذیلی چاند ہیں یعنی مشتری کے بارہ (۱۲) اور زحل کے دس (۱۰) دونوں سیّاروں کے زیادہ تر چاند ان کی مخالف سمت میں چکّر لگاتے ہیں یعنی اگر سیّارہ دائیں سے بائیں چکّر لگاتا ہے تو اس کا چاند اس کے گرد بائیں سے دائیں چکّر لگاتا ہے۔ آخری مشترک بات یہ ہے کہ دونوں سیّاروں کی اپنی ایک مکمل جُدا شکل ہے جو کسی سے نہیں ملتی۔ زحل کے گرد تین مخصوص حلقے ہیں جب کہ مشتری کے گرد سُرخ دھبّے سے دکھائی دیتے ہیں جو پچیس ہزار (۲۵،۰۰۰) میل لمبے اور آٹھ ہزار (۸،۰۰۰) میل تک پھیلے ہُوئے ہیں۔

مرّیخ (MARS) رومیوں کے "جنگ کے دیوتا" کا نام مرّیخ تھا۔ اس کا رنگ سُرخ ہے۔ یہ واحد سیّارہ ہے جس کی سطح زمین سے صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کی سطح پر جو کچھ ہے اُس میں سے مختلف چیزیں پہچان لی گئی ہیں۔ ماہرینِ فلکیات کسی بھی دُوسرے سیّارے کے مقابلے میں مرّیخ کے متعلق زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کا قطر چار ہزار ایک سو تیس (۴،۱۳۰) میل ہے جو زمین کے قطر کے مقابلے میں آدھا ہے۔ اس کی کمیت زمین کی کمیت سے ۱/۱۰ ہے۔ اس کی کشش زمین کے مقابلے میں ۲/۵ اور کثافت ۳/۴ ہے۔
اِس کی فضا کی کثافت، جو زمین کے مقابلے میں (۱۰) گنا کم ہے، میں کاربن ڈائی آکسائیڈ

زمین کے مقابلے میں دوگنا ہے جب کہ زمینی زندگی کے لیے بنیادی گیس آکسیجن وہاں پر معلوم نہیں کی جا سکی۔ اس کا زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت ۷۰ سے لے کر ۸۰ ڈگری اور کم سے کم نفی ایک سو بچاس (۱۵۰-) ڈگری فارن ہیٹ ہے۔ آٹھ سو سڑسٹھ (۸۶۷) دن کے سال والے اس سیارے کے بھی چار موسم ہیں۔ اس کا سبب سے لمبا موسم، موسمِ گرما ہے۔

اگرچہ "طیف گری" (SPECTOGRAPHY) کے مطالعے سے وہاں پر کلوروفل کا کوئی نشان نہیں ملتا، سبز پودوں کے لیے بے حد ضروری اور بنیادی چیز ہے، لیکن پھر بھی وہاں پر نامیاتی مولیکیولوں (ORGANIC MOLECULES) کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جس سے مریخ پر کسی قسم کی زندگی کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ مریخ سورج کے گرد چکر لگاتے ہوئے ہر پندرہ یا سترہ سال کے بعد زمین سے تین کروڑ ساٹھ لاکھ (۳۶,۰۰۰,۰۰۰) میل کے فاصلے سے گزرتا ہے۔ مریخ کا سورج کے گرد چکر لگاتے ہوئے زمین سے مذکورہ فاصلے سے گزرنے کا علم پہلی بار ۱۹۵۶ء میں اور دوسری بار اگست ۱۹۷۱ء میں ہوا تھا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اب مریخ ۱۹۸۶ء کے آخر میں زمین کی طرف سے ہو کر گزرے گا۔

دوسرے سیاروں پر زندگی

کسی سیارے پر زندگی کے آثار صرف اسی صورت میں ہو سکتے ہیں جب وہاں زمینی فضاء ہوگی۔ مثلاً ایک ایسا سیارہ جس پر زندگی ہوگی اس کے درجۂ حرارت کی حدود ۳۲ سے لے کر ۲۱۲ ڈگری فارن ہیٹ تک ہونی چاہیں۔ یہ وہ حدود ہیں جس میں پانی مائع صورت میں رہ سکتا ہے۔ اگر درجۂ حرارت اس سے کم ہوگا تو کیمیائی عمل نہایت سست ہوگا۔ اور درجۂ حرارت زیادہ ہونے کی صورت میں ہائیڈروجن اور کاربن کے درمیان موجود رابطہ ختم ہو جائے گا جو زندگی کے بنیادی اور اہم ترین عناصر ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سیارے کی فضاء ایسی ہونی چاہیے، جس میں جاندار سانس لے سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سیارے کے گرد چاروں طرف فضاء موجود ہو۔ کیوں کہ اگر سیارہ بہت چھوٹا ہوگا تو اس کی کششِ سطح کا کھچاؤ اس قدر کم ہوگا کہ وہ فضا میں سے گزر

کر خلا کی طرف جانے والی گیسوں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکے گا۔

آخری بات یہ ہے کہ اس سیارے کا سورج مناسب جسامت کا ہونا چاہیے کیوں کہ ضرورت سے چھوٹا سورج صرف اتنی حرارت پیدا کرے گا کہ جس سے سیارے کا ایک مخصوص حصہ ہی روشنی اور گرمی حاصل کرے گا جب کہ ضرورت سے بڑا سورج اپنی گرمی ہی سے سیارے میں موجود زندگی کو ختم کر دے گا۔ ان تمام حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے بھی ماہرین اس بات پر پوری طرح متفق ہیں کہ صرف ہماری کہکشاں میں لاکھوں ستارے ایسے ہیں جہاں زندگی ممکن ہے۔

اب ہم اپنے نظامِ شمسی میں موجود نو ستاروں کی چند اور خصوصیات کا مطالعہ کریں گے۔

نظامِ شمسی کے سیاروں کے چاند:
(MOONS OF THE SOLAR SYSTEM'S PLANES)

جس طرح ہماری زمین کے گرد ایک سیارہ گردش کرتا ہے جسے ہم چاند کہتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے سیاروں کے گرد بھی ان کے اپنے چاند (سیارے) چکر لگاتے ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے سیاروں کے چاند درج ذیل ہیں:

(۱) عطارد : صفر (۲) زہرہ : صفر (۳) زمین : ایک
(۴) مریخ : دو (۲) (۵) مشتری : بارہ (۱۲) (۶) زحل : دس (۱۰)
(۷) یورینس : پانچ (۵) (۸) نیپچون : دو (۲) (۹) پلوٹو : نامعلوم

سیاروں کی علامات: (SYMBOLS OF PLANETS)

نظامِ شمسی میں موجود سیاروں کے نام اور علامتیں بہت پرانی ہیں۔ اور ماہرینِ فلکیات آج بھی وہی قدیم علامات استعمال کرتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سورج اور چاند کے لیے جو علامات استعمال کی جاتی ہیں، وہ پرانے زمانے میں سونے اور چاندی کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔

عطارد کو، جسے "پیغام بر" بھی کہا جاتا تھا، سینگوں والے عصا سے ظاہر کرتے ہیں۔ زہرہ اور مریخ کو مذاقی انداز میں بالترتیب نر اور مادہ سے ظاہر کرتے ہیں۔

پلوٹو
نیپچون ..
یورینس ......
زُحل
....
مُشتری
....
مرّیخ ..
زمین .
زُہرہ
عُطارد

زمین کو ایک دائرے سے ظاہر کرتے ہیں جس میں دو لکیریں ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں۔ مشتری کو ایک چمک دار ہک (کھونٹے) سے ظاہر کرتے ہیں۔
زحل کسی زمانے میں کرونوز (KRONOS) کہلاتا تھا، اس لیے اسے انگریزی زبان کے حرف کے (K) سے ظاہر کرتے ہیں۔ یورینس جو ۱۷۸۱ء میں دریافت ہوا تھا۔ اس کی علامت ایک دائرہ ہے، جس کے اندر ایک بڑا سا گول نقطہ اور باہر کی طرف تیر کا نشان ہے۔ نیپچون جو ۱۸۴۶ء میں دریافت ہوا، سمندر کے دیوتا کے تیر شول سے ظاہر کرتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں دریافت ہونے والے پلوٹو کی علامت اُس کے پہلے دو حرف ہیں۔
یاد رہے کہ پلوٹو کے سوا سارے سیاروں کے نام اور علامتیں قدیم رُومی اور یونانی دیویوں اور دیوتاؤں کے ناموں اور ان کی علامات پر مشتمل ہیں۔
اب تمام سیاروں کا اکٹھا چارٹ بتانے سے پہلے ہم آپ کو چارٹ میں استعمال ہونے والی سائنسی اصطلاحات کی تعریف بتا رہے ہیں۔

کمیّت (MASS): کسی جسم میں مادّے کی کل مقدار کو کمیت کہتے ہیں۔ کسی جسم کی کمیّت اپنے وزن کے برعکس ہر جگہ یکساں ہوتی ہے مثلاً پہاڑوں کی چوٹی پر کسی جسم کا وزن سمندر کی سطح سے کم ہوتا ہے لیکن یہی وزن خطِ استوا کے نزدیک معمول سے زیادہ ہو گا۔ ایک دوسری اور آسان مثال لیجیے کہ اگر کسی شخص کا وزن زمین پر ایک سو ساٹھ (۱۶۰) پونڈ ہو گا تو چاند پر یہی وزن چالیس (۴۰) پونڈ کے برابر ہو گا۔ مگر اس جسم یا شخص کی کمیّت ہر جگہ یکساں رہے گی۔ کمیّت کی اکائی کو گرام GRAM کہتے ہیں۔

حجم (VOLUME): کوئی جسم جتنی جگہ گھیرتا ہے، اُسے اُس کا حجم کہا جاتا ہے۔ حجم کی اکائی لٹر LITRE کہلاتی ہے۔ ایک کلو گرام (ایک ہزار گرام) پانی تین اعشاریہ نو آٹھ (۳.۹۸) سینٹی گریڈ پر جتنی جگہ گھیرتا ہے، وہ ایک لٹر کے برابر ہے۔

محوری گردش (ORBITAL MOTION): سیاروں کی روزانہ گردش کو، جس سے ان کے دن رات پیدا ہوتے ہیں۔ محوری گردش کہتے ہیں۔ یہ گردش محور کے گرد ہوتی ہے، اس لیے اسے محوری گردش کہتے ہیں۔

سالانہ گردش: تمام سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ کیوں کہ تمام سیارے سورج کے گرد اپنا ایک چکر اپنے اپنے دنوں کے مطابق ایک سال میں طے کرتے ہیں۔ اِسی لیے اسے سالانہ گردش کہتے ہیں۔

سطحی کشش: (SURFACE PULL) کسی سیارے کی سطح کی وہ کشش یا کھچاؤ جس کی مدد سے وہ سیارہ اپنی فضا میں معلق چیزوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے، سطحی کشش کہتے ہیں۔

رفتارِ انخلاء: (ESCAPE VELOCITY) وہ رفتار جس پر پہنچ کر کوئی جسم اپنے سیارے کی سطحی کشش سے آزاد ہو جائے اُسے رفتارِ انخلاء کہتے ہیں۔ اگر کسی جسم کی رفتار مطلوبہ رفتار سے کم ہو گی تو وہ آخر کار سطحی کشش کی وجہ سے اپنے ہی سیارے میں واپس آ گرے گا۔

سرور بجنوری

ڈاک
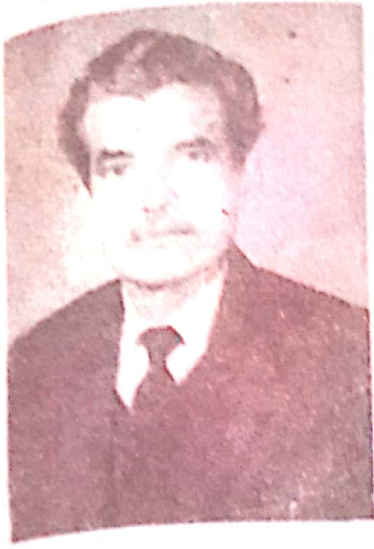
ڈاک کا انتظار رہتا ہے
دل بہت بے قرار رہتا ہے

ڈاک لاتا ہے ڈاکیہ گھر پر
بچّے لیتے ہیں اس کو بڑھ چڑھ کر

ڈاک بھی کیا عجیب ہوتی ہے
پڑھ کے راحت نصیب ہوتی ہے

خط خوشی کا پیام لاتے ہیں
دوستوں کا سلام لاتے ہیں

قدر و قیمت ہے ڈاک کی بھاری
کاروباری ہو یا ہو سرکاری

ہر مہینے رسالے آتے ہیں
پڑھنے والوں کا دل لبھاتے ہیں

ڈاک آتی ہے، ڈاک جاتی ہے
زندگی میں سُرور لاتی ہے

وہ آئی ہنسی

ایک صاحب کی نظر بہت کمزور تھی، وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے اور کہنے لگے، ڈاکٹر صاحب! مجھے ایسی عینک لگائیں، جس سے ہر چیز موٹی نظر آئے، ڈاکٹر صاحب نے اُنھیں ایسی عینک لگا دی۔ یہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ اسی خوشی میں یہ صاحب بازار میں سے گزر رہے تھے، کہ اُنھوں نے غبارے دیکھے، تو سوچنے لگے، کیوں نہ میں اپنے بچوں کے لیے غبارے لے جاؤں، وہ ریڑھی والے کے پاس گئے اور کہنے لگے جناب! ایک غبارے کی کیا قیمت لگا رہے ہو؟

ریڑھی والے نے کہا، میاں ہوش سے کام لو، یہ غبارے نہیں، انگور ہیں۔

ذوالفقار قریشی۔ چک ۶۶ گ ب

رات کا وقت تھا۔ ایک ماں اور بیٹا سو رہے تھے کہ اچانک بیٹے کی آنکھ کھُل گئی۔ پھر اُس نے اپنی ماں کو جگایا اور بولا:

ماں! مجھے پانی لا دیں۔

ماں: چُپ کر کے سو جاؤ ورنہ ڈنڈا لا کر ماروں گی۔

بیٹا: جب ڈنڈا لینے جائیں تو پانی بھی لیتی آئیں۔

اِرم قدیر۔ سوات

ماں: آج تمھاری بڑی بہن کی شادی ہے۔ تم کیوں رو رہی ہو؟

بیٹی: امی جان! پہلے تو ہمارے گھر کا کام باجی کرتی تھی۔ اب مجھے کرنا پڑے گا۔

ظفر اقبال۔ لائل پور

ایک دوست نے بازار میں اپنے دوست کو دیکھا۔ اِس کی ٹائی کے دُوسرے سِرے پر گانٹھ دی ہُوئی تھی۔ دوست کے پُوچھنے پر اس نے بتایا کہ مجھے کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ بیوی نے یہ گانٹھ دے کر کہا تھا کہ میرا خط پوسٹ کرنا نہ بھُولنا۔ دوست نے پُوچھا — "خط پوسٹ کر دیا؟" — اُس نے جواب دیا — بیوی خط دینا بھول گئی ہے۔

سیّد کوثر علی شاہ۔ راولپنڈی

گاہک بے چارہ کافی کا انتظار کرتے کرتے تنگ آگیا تو ہوٹل سے اُٹھ کر جانے لگا۔ اتنے میں بیرا آگیا اور میز پر کافی رکھتے ہُوئے بولا: ناراض نہ ہوں جناب! بڑی مزے دار کافی ہے، جنوبی امریکا کی ہے۔

گاہک: معاف کرنا مجھے معلوم نہ تھا کہ تم میری خاطر اتنے دُور چلے گئے ہو۔

خالد بن اسلم۔ لاہور

ایک میاں صاحب ایک دن ہانپتے کانپتے گھر میں داخل ہوئے۔ اُنھوں نے ہاتھ میں ایک چاندی کا کپ پکڑا ہُوا تھا۔ بیوی نے پُوچھا کہ یہ کپ کہاں سے ملا؟ تو میاں نے کہا کہ دوڑ میں فرسٹ آیا ہوں۔ بیوی نے پُوچھا کہ دوسرے اور تیسرے نمبر پر کون آیا ہے؟ میاں نے کہا کہ دوسرے نمبر پہ کانسٹیبل اور تیسرے نمبر پہ کپ کا مالک۔

آسیہ۔ راولپنڈی

الیکشن کا زمانہ تھا۔ ایک صاحب نے دیکھا کہ ایک من چلے نے اپنے سینے پر چمک دار چمچہ لگا رکھا ہے۔ وہ بڑے حیران ہُوئے اور اُس کے پاس جا کر پُوچھا: بھئی! یہ کون سی پارٹی کا نشان ہے؟ منچلا مُسکرا کر بولا! یہ کسی پارٹی وارٹی کا نشان نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جو پارٹی بھی جیتے گی میں اس کا چمچہ ہوں۔

فاروق مروّت۔ فتح گڑھ

جج: تمھیں چوری کرتے ہُوئے شرم نہیں آتی۔

چور: جناب! اگر شرم نہ آتی ہو تو رات کو چھُپ کر چوری کیوں کروں۔ (رضوان ملال۔ کراچی)

اِدھر اُدھر سے

۱- تارے :- یہ عام طور پر رات کو جگمگاتے دیکھے گئے ہیں۔ لیکن اگر کسی کو غصّہ آجائے تو وہ آپ کو یہ تارے دن کو بھی دکھا سکتا ہے۔ محاورے میں ان کو توڑ کر بھی لایا جا سکتا ہے۔

۲- جُوتا :- اگر دُولہا کا ہو تو چھپایا جا سکتا ہے میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ اگر مرد کے پاؤں تلے ہو تو جوتا اور عورت کے پاؤں تلے ہو تو جوتی کہلاتا ہے۔ پہننے کے علاوہ "کھینچ" کر مارنے کے بھی کام آتا ہے۔

۳- سڑک :- آمد و رفت کے علاوہ ناپنے کے کام آتی ہے۔ مثلاً گاؤں سے ایک لڑکا شہر میں نوکری کی تلاش میں آیا۔ گاؤں سے ماں کا خط آیا جس میں لکھا تھا "بیٹا!

کوئی نوکری ملی؟ بیٹے نے لکھ دیا ابھی تو صرف سڑکیں ناپ رہا ہوں۔ ماں کا دوسرا خط آیا جس میں لکھا تھا "بیٹا نوکری تو اچھی ہے بتاؤ تنخواہ کتنی ملا کرے گی؟

۴۔ چشمہ:۔ عام طور پر اس سے مراد نظر کا چشمہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے چشمے کے مالک آپ خود ہوتے ہیں مگر یہ پھر بھی آپ کا نہیں بلکہ نظر کا چشمہ کہلاتا ہے مثلاً "ایک صاحب چشمہ لگا کر اخبار پڑھ رہے تھے۔ دوسرے صاحب قریب سے گزرے تو پوچھا "یہ چشمہ نظر کا ہے؟ پہلے صاحب نے جواب دیا: جی نہیں! یہ میرا ہے۔

چشمے کی ایک قسم اور ہوتی ہے۔ لیکن اس میں شیشہ اور فریم نہیں ہوتے آپ سمجھ گئے؟ جی ہاں پانی کا چشمہ۔

۵۔ ٹانگیں:۔ چلنے پھرنے کے علاوہ، ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھنے کے کام آتی ہیں۔ یہ دوسروں کے کاموں میں اڑائی بھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات کسی کو ٹانگ مار بھی دیتے ہیں لیکن اگر یہ کارنامہ کوئی گدھا سرانجام دے تو اسے دولتی کا نام دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ اشتہار کچھ اس طرح لکھا تھا۔

ضرورت ہے

ٹانگوں کی۔ ہمارے یہاں کی سلی ہوئی پتلونوں میں ڈالنے کے لیے۔

۶۔ جال:۔ بہت سے سوراخوں کو ایک دوسرے سے باندھ دیتے ہیں تو ایک جال بن جاتا ہے۔ مچھلیاں اور پرندے پکڑنے کے کام آتا ہے۔ شہر میں سڑکوں کا جال پھیلا ہوتا ہے۔ کسی کے خلاف سازشوں کا جال بھی پھیلایا جاتا ہے۔ اگر جال کسی مکڑی نے پھیلایا ہو تو اسے "جالا" کہا جاتا ہے۔

مظہر غفور۔ راولپنڈی

کیلنڈر کیا آپ کو معلوم ہے؟

۷۵۳ قبل مسیح میں رومن قوم نے ایک کیلنڈر رائج کیا۔ تاریخوں کا حساب چاند کے حساب سے کیا جاتا تھا۔ ہفتہ سات دن کا اور سال دس ماہ کا مقرر کیا گیا۔ اس کیلنڈر کا پہلا مہینہ مارچ اور آخری مہینہ دسمبر تھا لیکن بعد میں دو مہینوں کا اضافہ کیا گیا۔ اس طرح سال بارہ مہینوں کا ہوگیا۔ ان دو مہینوں کے نام جنوری اور فروری قرار پائے۔ مہینوں کا شمار بھی سورج کے گرد زمین کی گردش کے حساب سے ہونے لگا۔ اس طرح سال کے ۳۶۵ ¼ دن ہو گئے۔ چاند کے بارہ ماہ ۳۵۴ دن کے برابر ہیں۔ اس لیے اگر سال ۱۲ قمری مہینوں کا شمار کیا جائے تو تقریباً ۱۱ دن موسموں کے لحاظ سے کم ہو جاتے ہیں رومی لوگوں نے قمری مہینوں والے کیلنڈر کو موسموں کے مطابق رکھنے کی کوشش کی۔ اس طرح وہ ہر تین یا چار سال کے بعد ایک بے نام تیرھواں مہینہ بنا لیتے اور تمام قمری مہینوں کو پھر سے مقررہ موسموں میں لے آتے۔ اس طرح سے بعض سال ۱۲ ماہ کے اور بعض سال ۱۳ ماہ کے ہو جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کیلنڈر کا یہ نظام خراب ہوگیا۔

۴۶ قبل مسیح سے شمسی کیلنڈر تیار کیا گیا اور سال ۳۶۵ ¼ دن کا مقرر ہوا۔ عام سال ۳۶۵ دن کا مقرر ہوا اور ہر سال کے زائد چوتھائی دن کو اکٹھا کر کے چار سال بعد پورا ایک دن بنا کر فروری کے مہینے میں شامل کر دیا جاتا۔ شمسی سال اور موسمی سال میں مکمل طور پر صحیح مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے ۱۵۸۲ء میں ۱۰ دن کا فرق ہوگیا اور اس فرق کو ختم کرنے کے لیے لیپ کے سالوں کے فارمولے میں ترمیم کی گئی یعنی صدی کا وہی

سال لیپ کا سال ہوگا جو ۴۰۰ پر پورا تقسیم ہو۔ یہ ترمیم ماہرین فلکیات کے مشورے سے کی گئی اور اُس وقت سے یہ کیلنڈر موسموں کے ساتھ چل رہا ہے۔ اِس وقت صرف ۲۶ سیکنڈ کا فرق ہے۔ اِس طرح سے آئندہ تین ہزار سالوں میں صرف ایک دن کا فرق پڑے گا۔ اِس کیلنڈر میں بھی مکمل طور پر یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے کوئی مہینہ ۲۸ کا کوئی ۳۰ کا اور کوئی ۳۱ دنوں کا شمار ہوتا ہے۔ ہر ماہ کسی خاص دن سے شروع نہیں ہوتا ہے تو اِس مشکل پر قابو پانے کے لیے ایک نیا عالمی کیلنڈر جس میں مندرجہ ذیل باتیں شامل ہیں، زیرِ غور ہے۔

(i) ہر سال بارہ ماہ کا ہوگا اور سال کو چار سہ ماہی میں تقسیم کیا جائے گا۔

(ii) ہر سہ ماہی کا پہلا مہینا اتوار کے دن سے شروع ہوگا۔

(iii) ہر سہ ماہی کا پہلا مہینہ ۳۱ دِنوں کا ہوگا۔ اور باقی دو ماہ ۳۰ دِنوں کے ہوں گے اِس طرح سال کے ۳۶۴ دِن بن جائیں گے۔

(iv) اور ایک بے نام دِن تیس دسمبر کے بعد ہوگا جس دن عام تعطیل ہوگی اور سال ۳۶۵ دن کا ہو جائے گا۔

(v) ہر سہ ماہی کا دوسرا مہینا بدھ کے دِن سے شروع اور تیسرا مہینہ جمعہ کے روز سے شروع ہوگا۔

یہ ابھی صرف ایک تجویز ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اِس پر آنے والے وقتوں میں عمل ہوتا ہے یا نہیں! ویسے کیلنڈر کا یہ معاملہ ہے خاصا دلچسپ!

S	M	T	W	T	F	S	S	M	T	W	T	F	S	S	M	T	W	T	F	S	S	M	T	W	T	F	S
30	31	•	•	•	•	1	•	•	1	2	3	4	5	•	•	1	2	3	4	5	•	•	•	•	•	1	2
2	3	4	5	6	7	8	6	7	8	9	10	11	12	6	7	8	9	10	11	12	3	4	5	6	7	8	9
9	10	11	12	13	14	15	13	14	15	16	17	18	19	13	14	15	16	17	18	19	10	11	12	13	14	15	16
16	17	18	19	20	21	22	20	21	22	23	24	25	26	20	21	22	23	24	25	26	17	18	19	20	21	22	23
23	24	25	26	27	28	29	27	28	[illegible]	•	•	•	•	27	28	29	30	31	•	•	24	25	26	27	28	29	30
1	2	3	4	5	6	7	•	•	•	1	2	3	4	31	•	•	•	•	1	2	•	1	2	3	4	5	6
8	9	10	11	12	13	14	5	6	7	[illegible]	9	10	11	3	4	5	6	7	8	9	7	8	9	10	11	12	13
15	16	17	18	19	20	21	12	13	14	15	16	17	18	10	11	12	13	14	15	16	14	15	16	17	18	19	20
22	23	24	25	26	27	28	19	20	21	22	23	24	25	17	18	19	20	21	22	23	21	22	23	24	25	26	27
29	30	31	•	•	•	•	26	27	28	29	30	•	•	24	25	26	27	28	29	30	28	29	30	31	•	•	•
•	•	•	•	1	2	3	•	•	•	•	•	•	1	•	•	1	2	3	4	5	•	•	•	•	1	2	3
4	5	6	7	8	9	10	2	3	4	5	6	7	8	6	7	8	9	10	11	12	4	5	6	7	8	9	10
11	12	13	14	15	16	17	9	10	11	12	13	14	15	13	14	15	16	17	18	19	11	12	13	14	15	16	17
18	19	20	21	22	23	24	16	17	18	19	20	21	22	20	21	22	23	24	25	26	18	19	20	21	22	23	24
25	26	27	28	29	30	•	23	24	25	26	27	28	29	27	28	29	30	•	•	•	25	26	27	28	29	30	3

Scanned by CamScanner

ان میں بے رحم جادوگر بھی ہیں جو جادو کے زور سے انسان کو پتھر بنا دیتے ہیں اور ایسی رحم دِل پریاں بھی جو غریب کو امیر اور فقیر کو بادشاہ بنا دیتی ہیں۔ پہاڑ جیسے خوف ناک دیووں اور جنوں سے ٹکر لینے والے بہادر شہزادے بھی ہیں اور ایسے سیدھے سادے بھولے بھالے گڈریے اور کسان بھی جن کی احمقانہ حرکتیں آپ کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیں گی۔

دیس دیس کی یہ کہانیاں فرخندہ لودھی، مقبول جہانگیر اور سیف الدّین حُسام نے آپ کے لیے آسان اور دِل چسپ زبان میں لکھی ہیں۔ اس سلسلے کی آٹھ کتابیں چھپ چکی ہیں۔

تانبے کے تین پیسے چینی کہانیاں

ایک بُوند شہد پاک و ہند کی کہانیاں

جادُو کی تلوار پولینڈ کی کہانیاں

بھوتوں کی دُنیا ناروے کی کہانیاں

ناگ پری ترکی کہانیاں

پنڈورا کا پٹارا یُونانی کہانیاں

سات بہنیں شمالی افریقہ کی کہانیاں

سوداگر کی بیٹی ایرانی کہانیاں

سچی خوشی!

محمد عمران یوسف

جاڑوں کا زمانہ تھا۔ تیز سردی اور زور دار بارش غضب ڈھا رہی تھی۔ سلمیٰ لحاف اوڑھے گرم گرم بستر پر لیٹی تھی۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ سلمیٰ امیر ماں باپ کی بیٹی تھی۔ اُس کی شان دار کوٹھی پانی میں نہائی کھڑی تھی۔ بارش کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے کھڑکی کھول کر دیکھا۔ پیچھے زرینہ کی جھونپڑی تھی۔ زرینہ بہت غریب لڑکی تھی۔ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ماں سخت بیمار تھی۔ اتنی تیز بارش میں ڈر تھا کہ کہیں اس کی جھونپڑی نہ گر جائے۔ ایک پھٹا ہُوا کمبل ہی زرینہ کے پاس تھا۔ اتنی تیز سردی میں زرینہ نے اس پھٹے کمبل سے اپنی ماں کو اچھی طرح لپیٹ دیا۔ کوٹھڑی میں ہر طرف پانی ٹپک رہا تھا۔ صرف ایک کونہ بچا تھا جس میں زرینہ نے اپنی ماں کو لٹا دیا۔ سلمیٰ کھڑکی کھولے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ زرینہ پریشانی میں کبھی باہر جاتی، کبھی اندر—— سلمیٰ سے یہ سب کچھ دیکھا نہ گیا۔ اُس کو اُسی وقت اپنے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ پیاری حدیث یاد آ گئی۔

"وہ مسلمان نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا سوئے۔"
یہ حدیث یاد آتے ہی وہ اپنے بستر سے اُٹھی اور اپنی الماری کھول کر اُس نے ایک خوب صورت کوٹ اور دو سوئیٹر نکالے اور امّی سے جا کر دو خوب صورت کمبل مانگے۔ سلمٰی یہ سب چیزیں زرینہ کو دینے جا رہی تھی۔ اُس کے گھر جا کر دونوں سوئیٹر زرینہ کو دیئے اور کوٹ زرینہ کی ماں کو پہنچا دیا اور خوب اچھی طرح کمبل سے لپیٹ دیا۔ زرینہ کی ماں نے سلمٰی کو خوب دعائیں دیں۔ آج سلمٰی کو سچی خوشی ملی تھی۔

زندگی کا مقصد!

خالد محمود نازؔ، بہاولنگر

اکبر بیٹا! اُٹھو کالج جانے کا وقت ہو رہا ہے۔
نہیں امّی جان میں کالج نہیں جاؤں گا۔
کیوں بیٹے! کیا طبیعت ناساز ہے؟
امّی جان یہ بات نہیں۔ بلکہ میں خود اب پڑھنا نہیں چاہتا۔ میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ آپ بڑھاپے میں بھی محنت کریں۔ اور میں جوان ہو کر بھی مفت میں کھاؤں۔ اس لیے اب میں نے سوچ لیا ہے کہ اب میں محنت مزدوری کروں گا اور آپ آرام کریں گی۔
تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تمھاری ماں بوڑھی ہو گئی ہے۔ اس کے ہاتھ محنت کرتے کرتے تھک گئے ہیں...... پگلے...... ابھی تو میری زندگی کا مقصد بھی پورا نہیں ہوا۔ اور تو مجھے آرام کا مشورہ دے رہا ہے۔ چل اٹھ اور کالج جانے کی تیاری کر۔

اکبر ایف۔ایس۔سی کا طالب علم تھا۔ اُس کے باپ نے مرتے وقت اس کی ماں سے وعدہ لیا تھا۔
"گوری! وعدہ کرو کہ تم میرے مرنے کے بعد اکبر کو ڈاکٹر بناؤ گی تاکہ کوئی

Scanned by CamScanner

غریب بغیر دوا کے نہ مرے۔ جس طرح میں دوا و علاج کے بغیر اس دُنیا سے رُخصت ہو رہا ہوں!"

کیوں مایوسی کی باتیں کر رہے ہیں۔ ابھی تو آپ کو زندہ رہنا ہے۔ میرے سرتاج..... میرے لیے، اپنے اکبر کے لیے۔

نہیں گوری! اب میرا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ اکبر کو اپنی جان بیچ کر بھی ڈاکٹر بناؤ گی......

.... اتنا کہنے کے بعد اکبر کے والد نے ایک آخری ہچکی لی اور اس بے درد دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔

اکبر کے اس چھوٹے سے گھر میں کہرام مچ گیا۔ ان کے رشتے دار آئے اور افسوس کر کے چلے گئے۔

حالات پھر اپنی روش پر آگئے۔ اکبر کی ماں نے محنت مزدوری شروع کر دی۔ پہلے پہل تو وہ محلّے والوں کے برتن وغیرہ مانجھا کرتی تھی مگر پھر اُس نے کپڑے دھونے کا کام شروع کر دیا۔ وہ محلّے بھر کے میلے کپڑے اکٹھے کر کے دریا پر لے جا کر ان کو دھوتی اور پھر سُکھا کر ان کے مالکوں کو لا دیتی۔ یُوں اکبر کے گھر کا گزارہ چل رہا تھا۔ اکبر کی ماں ایک عقل مند عورت تھی۔ وہ اس میں سے بھی کچھ بچا کر مشکل وقت کے لیے رکھ لیتی تھی۔ جب تھوڑے سے پیسے ہو گئے تو اُس نے ایک اِستری بھی خرید لی۔ یُوں اس کو اپنی محنت کی زیادہ اُجرت ملنے لگی۔

اِدھر اکبر نے ایف ایس سی کا اِمتحان ہائی فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ جس کی وجہ سے اُسے میڈیکل کالج میں آسانی سے داخلہ مِل گیا۔ اکبر کو اپنی بوڑھی ماں کی محنت کا احساس تھا۔ اس لیے وہ دل لگا کر پڑھائی کر رہا تھا۔ یہ پانچ سال کا عرصہ بھی پلک جھپکنے میں گزر گیا اور اکبر نے میڈیکل کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور وہ اس کالج میں سے ڈاکٹر بن کر نکلا۔

جب وہ اپنے پاس ہونے کی خبر اپنی ماں کو سنانے کے لیے اپنے شہر روانہ

ہوا تو اُس کا دِل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ اُس نے جب یہ خوش خبری اپنی ماں کو سُنائی تو اس کا چہرہ کِھل اُٹھا۔ اور اُس نے اکبر کو خوب پیار کیا پھر دو رکعت نماز نفل پڑھی اور دُعا میں کہا۔ "میرے سرتاج! تم نے جو مجھ سے وعدہ لیا تھا وہ میں نے پورا کر دیا ہے۔ دیکھو تمھارا اکبر اب ڈاکٹر اکبر ہے۔ اور پھر وہ نماز سے اُٹھ کر اکبر کے پاس آئی اور نصیحت کی۔ بیٹا! غریبوں کا علاج مُفت کرنا۔

ہاں ماں! یہ تو میرے باپ کی بھی آرزو تھی کہ میں غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کا علاج مُفت کروں۔

بیٹا! میں تمھیں دوبارہ نصیحت کرتی ہوں کہ تمھارے دروازے سے کوئی ناکام نہ لوٹے۔ اتنا کہنے کے بعد وہ جا کر ایک چارپائی پر لیٹ گئی اور کلمہ شہادت پڑھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

اکبر دوڑ کر اپنی ماں کے پاس گیا۔ تو اس عظیم ہستی کی رُوح اپنے جسم سے جُدا ہو چکی تھی۔ کیوں کہ اُس کی زندگی کا مقصد جو پُورا ہو گیا تھا۔

خطرناک منصوبہ!

بابر محمود بھٹی۔ لاہور

رات کے ایک بجے ہوں گے کہ سیٹھ عبداللہ کے گھر کے سامنے ایک لمبی سی سیاہ کار رُکی اور اُس میں سے پانچ نقاب پوش نِکلے اور اندر داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ دُوسری منزل پر شیشے کی ایک کھڑکی تھی۔ وہ رَسّی کے ذریعے اُوپر پہنچے اور کھڑکی کو دھکا دیا۔ وہ کُھل گئی۔ وہ اندر داخل ہونے کے بعد تجوری تلاش کرتے رہے۔ تجوری مِلنے پر ایک لاکھ اسّی ہزار رُوپے کا زیور چُرایا اور رات کے اندھیروں میں واپس چلے گئے۔

دُوسرے دِن اخبارات میں واردات کی جلی سُرخی چھپی۔ ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ایک ڈکیتی اور ہُوئی۔ پھر ڈاکے پر ڈاکے پڑنے لگے۔ انسپکٹر جلیل جنھیں پولیس والے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، وہ حالات سے بھانپ گئے تھے کہ یہ لوگ

کافی عقل مند ہیں۔ ایک دن دفتر سے اُن کو دیر ہوگئی اور پونے دس ہو گئے وہ واپس آرہے تھے کہ راستے میں ایک گاڑی گزری۔اُس میں تین نقاب پوش سوار تھے۔ وہ سیدھے "نوابزادہ ظہیر" کی کوٹھی پر پہنچے۔اُنھوں نے فوراً کھڑکی کی جالی کو کسی آلے سے کاٹا اور اندر داخل ہوگئے۔ انسپکٹر جلیل نے فوراً کار درختوں کے جھنڈ میں کھڑی کی۔ گاڑی کے فون سے پولیس کو آگاہ کیا۔ وہ اُسی کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہوئے۔ وہ بالکل بے خبر تھے۔ انسپکٹر نے انھیں اچانک جا لیا اور گرجے: خبردار کوئی نہ ہلے۔ ایک ملزم نے بھاگنے کی کوشش کی مگر انسپکٹر نے گولی چلا دی۔ اُس نے بھی فائر کیا۔ مگر انسپکٹر نے فائر سے پہلے ہی اُس پر چھلانگ لگا دی۔ جس سے نشانہ چُوک گیا اور گولی اُس کے بھاگتے ہوئے ساتھی کو لگی جو ہائے کرکے بیٹھ گیا۔ انسپکٹر نے اُس کو قابو کرکے تیسرے ملزم کی طرف توجہ دی۔ وہ سڑک پر بھاگ رہا تھا۔ مگر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے۔ پولیس نے اس ملزم کو گرفتار کرلیا۔ وہ فوراً اُن لوگوں کے اڈے پر پہنچے۔ اُن کے خواب دخیال میں بھی یہ نہیں تھا۔ پہلے تو اُنھوں نے فائرنگ کی۔ مگر آخر ہتھیار ڈال دیے۔ مجرموں کے لیڈر نے بھاگنا چاہا۔ مگر وہ قانون کے ہاتھوں کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ اُس نے بتایا کہ "وہ یہ تمام پیسہ بانٹ کر دُوسرے مُلک میں عیش و آرام سے رہنا چاہتے تھے۔" مگر پولیس نے چوروں کو پکڑ لیا اور وارداتوں کا یہ بھیانک سِلسِلہ ختم ہو گیا۔

روئیل رومی سرکار، لاہور

ایمان کا انجام!

بچّو! ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو بہت امیر اور زور آور بادشاہ رہتے تھے۔ ایک بادشاہ رحم دِل، نیک دل اور مال دار تھا جب کہ دُوسرا سخت اور بے رحم تھا، پر تھا وہ بھی بہت مال دار۔

دونوں بادشاہ ایک دُوسرے سے بے حد نفرت کرتے تھے اور جب کبھی

موقع ملتا تو ایک دُوسرے پر حملہ کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ رحم دل بادشاہ سخت بیمار ہو گیا اور کافی کمزور ہو گیا۔ جب سخت دل بادشاہ کو یہ خبر ملی تو اُس نے فوراً فوج کو تیار کیا اور حملہ کر دیا۔

رحم دل بیمار ہونے کی وجہ سے لڑائی نہ کر سکا۔ اُس کی فوج ہار گئی۔ سخت دل نے تو رحم دل بادشاہ کو قتل کر دیا اور اُس کے ایک خُوب صُورت بیٹے کو قید کر کے لے گیا۔

یہ لڑکا خُوب صُورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین اور خُدا پرست بھی تھا۔ نہ وہ کبھی شاہی لباس پہنتا اور نہ شاہی کھانا کھاتا۔ کچھ سال گزر گئے تو بادشاہ کو کچھُ حکمرانوں کی ضرورت پڑی۔

بادشاہ نے چار، پانچ جوانوں کو چُن لیا، ان میں رحم دل بادشاہ کا خُوب صُورت بیٹا بھی تھا کیوں کہ سخت دل بادشاہ اور لوگ اُسے پسند کرتے تھے۔ بادشاہ نے اُس کی ذہانت سے خُوش ہو کر اُسے وزیرِ اعظم بنا دیا۔

اب جو دُوسرے شہروں کے حکمران تھے، دانی، یعنی رحم دل بادشاہ کے بیٹے سے جلنے لگے اور کوئی طریقہ سوچنے لگے جس سے وہ دانی کو بدنام کر سکتے ہوں۔ اب، بچّو! جس ملک کا دانی وزیرِ اعظم تھا، وہاں عبادت کرنا منع تھا اور دانی ہر روز اپنے خُدا کے سامنے عبادت کرتا تھا۔

جب دُوسرے حکمرانوں نے یہ دیکھا تو بادشاہ کو جا کر بتا دیا۔ پہلے تو بادشاہ نے دانی کو حکم دیا کہ وہ عبادت نہ کیا کرے لیکن دانی پھر بھی منع نہ ہُوا تو بادشاہ کو مجبوراً دانی کو شیروں کی غار میں ڈالنا پڑا۔

چند دِن کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ دانی کی اگر کچھُ ہڈیاں بچ گئی ہوں تو اُن کو نکال کر دفن کر دو، پر جب اُنھوں نے دروازہ کھولا تو کیا دیکھتے ہیں! کہ دانی سجدے میں ہے اور شیر اُس کے اِرد گرد بیٹھے ہیں۔

بادشاہ یہ دیکھ کر بڑا حیران ہُوا۔ دانی کو باہر بلایا اور اُس کو کھانے کو دیا۔ یہ دیکھ کر کہ دانی کو کچھُ نہیں ہُوا تو بادشاہ نے اپنے خراب کام چھوڑ دیے اور

دانی کے خُدا کو ماننے لگا۔ کیوں کہ اُسے پتا چل گیا تھا کہ اصل خُدا کون ہے اور اُس پر ایمان لانے کا کیا نتیجہ ہے۔
کچھ عرصے کے بعد بادشاہ اچانک بیمار ہو گیا۔ ایک دن اُس نے دربار طلب کیا اور سارے دربار کے سامنے دانی کو بادشاہ بنا دیا۔
سوبچو! اگر ہم خُدا پر ایمان رکھیں اور اُس سے ڈرتے رہیں تو وہ ہم کو ہر قسم کی مشکل اور مصیبت سے بچا لے گا۔ چاہے ہم کیسی ہی مصیبت میں کیوں نہ ہوں، وہ ہماری مدد کرے گا۔

چاندی کی چابی!

افتخار قریشی۔ اسلام آباد

بجلی چمکی اور اُس کی روشنی میں احمد کو دُور سے ایک عمارت نظر آئی۔ احمد سمجھ گیا کہ یہ سرائے ہے۔ چنانچہ وہ اس تیز بارش میں جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہُوا سرائے کی طرف بڑھنے لگا تاکہ رات سرائے میں بسر کرے اور باقی سفر دُوسرے دن کرے۔
احمد اقبال نگر نامی قصبے میں رہتا تھا۔ وہ بہت ذہین اور اُصولوں کا پابند تھا۔ وہ ایسے موسم میں کبھی گھر سے نہ نکلتا اگر اسے "ڈھوک بھین" میں ایک ضروری کام نہ پڑ جاتا۔ لیکن اب سیاہ رات اور طوفان نے اسے بے حد پریشان کر رکھا تھا۔
جب احمد سرائے کے قریب پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ سرائے کا دروازہ بند ہے اُس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور دربان سے کہا: جلدی سے دروازہ کھولو میں بارش میں بھیگ رہا ہوں۔
سرائے کا دربان بہت لالچی تھا اور ہر وقت روپیہ پیسا جوڑنے کے لالچ میں رہتا تھا۔ اب اُسے موقع مل گیا۔ اُس نے جواب دیا "جناب! مجھے افسوس ہے کہ تالے کی چابی گم ہو چکی ہے۔ اب یہ دروازہ نہیں کھل سکتا البتہ اگر آپ چاندی کی چابی دے دیں تو میں اسے کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔" احمد سمجھ گیا کہ سرائے کا دربان چاندی کی چابی دراصل رُوپے کے سکّے کو کہہ رہا ہے۔

اسے دربان پر غصہ تو بہت آیا لیکن اس کو معلوم تھا وہ اندر نہیں جا سکتا

تھا اس لیے اُس نے جیب سے چاندی کا ایک روپیہ نکالا اور ایک سوراخ سے اندر دھکیل دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُس نے لالچی دربان کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

دربان نے روپیہ اُٹھا کر سرائے کا دروازہ کھول دیا۔ جب احمد اندر چلا گیا تو اُس نے دربان سے کہا: بھائی! باہر میرا سامان پڑا ہے۔ ذرا وہ تو اُٹھا لاؤ۔ حالانکہ اُس کے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ دراصل وہ لالچی دربان کو اس کے لالچ کی سزا دینا چاہتا تھا۔

جُوں ہی دربان باہر نکلا، احمد نے لپک کر دروازہ بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد دربان نے باہر سے چلّا کر کہا "باہر آپ کا سامان نہیں ہے۔ برائے مہربانی جلدی سے دروازہ کھول دیجیے۔ بارش کا ٹھنڈا پانی میرے جسم پر تلوار کی طرح کاٹ رہا ہے" مگر احمد نے جواب دیا "مجھے افسوس ہے کہ تالے کی چابی گم ہو چکی ہے، اب تالہ چاندی کی چابی کے بغیر نہیں کھُل سکتا۔ کیا تمھارے پاس چاندی کی چابی ہو گی؟" دربان احمد کا منصُوبہ سمجھ چکا تھا چنانچہ اُس نے مجبوراً وہی روپیہ جو احمد نے اُسے دیا تھا، جیب سے نکالا اور سوراخ میں سے اندر دھکیل کر بولا "صاحب! اب تو دروازہ کھول دو۔"

احمد نے روپیہ فرش پر سے اُٹھا لیا مگر دربان کو چند منٹ تک باہر ہی بھیگنے دیا اور پھر دروازہ کھولا۔ دربان کا سردی کے مارے بُرا حال تھا اور وہ بڑی طرح کانپ رہا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے لالچ نے اِسے نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے اُس نے آیندہ لالچ کرنے سے توبہ کر لی۔ اس کے بعد جب کسی طوفانی رات میں کوئی مسافر دروازہ کھٹکھٹاتا تو اچانک دربان کو یہ واقعہ یاد آ جاتا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ وہ فوراً اُٹھتا اور دروازہ کھول دیتا۔

"بتاؤں" بتاؤں "بتاؤں ....."

بشریٰ اشفاق۔ اسلام آباد

اُس دِن ہم سب خالہ جان کے گھر گئے۔" ارے ہاں کہانی شروع کرنے سے پہلے یہ بتا دوں کہ میں غصّے میں بہت جلدی آجاتی ہوں"۔ ہاں تو ہم خالہ جان کے گھر گئے وہاں ہماری دعوت تھی۔ ہم سب صُبح صُبح چلے گئے۔ خالہ کے گھر تھوڑی دیر تو میں اندر بیٹھی رہی۔ آخر جب میں اندر بیٹھی بیٹھی تنگ آگئی تو باہر گلی میں نکل آئی۔ ابھی مجھے باہر آئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ساتھ والے گھر سے ایک بہت خوب صُورت اور معصوم سا بچّہ نکلا۔ میں نے اُسے اپنے پاس بلایا اور پُوچھا کہ "تمھارا نام کیا ہے؟ کہنے لگا "عمران" مَیں نے اتنا پوچھا اور سوچنے لگی کہ اب کیا بات کروں۔ پھر مَیں نے ایک دم اُس سے پُوچھا "عمران! تمھارے گھر کیا پکا ہے" پہلے تو وہ کچھ نہ بولا: پھر میرے دوبارہ پُوچھنے پر بولا "بتاؤں" میں نے کہا "بتاؤ" پھر کہنے لگا "بتاؤں" میں نے کہا "بتاؤ" کافی دیر تک "بتاؤں بتاؤں" کی تکرار ہوتی رہی۔ آخر مجھے غصّہ آگیا اور میں نے ایک زور دار تھپیڑ اُسے رسید کر دیا۔ اُن صاحب نے بھی زور شور سے رونا شروع کر دیا۔ میں گھبرا کر اندر آگئی۔ کھانا لگ چکا تھا۔ سب نے کھانا شروع کیا۔ ابھی ایک دو نوالہ ہی کھائے تھے کہ خالہ جان کی ہمسائی آئیں اور خالہ کو بلا کر زور و شور سے پنجابی میں پتا نہیں کیا کیا بولتی رہیں اور چلی گئیں۔ خالہ جان اندر آئیں تو! اُف خدایا آنکھیں انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ بڑے غُصّے سے پُوچھا "تم نے میری ہمسائی کے لڑکے کو کیوں مارا ہے"۔ اتنے ہی غصّے سے جواب میں، مَیں نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور جب میں نے واقعہ ختم کیا تو سب نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا، اور خالہ جان نے جب مجھے یہ بتایا کہ "ارّی بے عقل! یہ لوگ پنجابی ہیں، اور ابھی حال ہی میں گاؤں سے آئے ہیں اور سنو بتاؤں پنجابی میں بینگن کو کیا کہتے ہیں"۔ جب میں نے یہ سُنا تو اپنی غلطی پر بہت نادم ہوئی۔

جرأت و بہادری
وطن دوستی، جاسوسی اور سراغ رسانی
کے کارناموں سے بھرپور
نہایت دِل چسپ ناول
سرکٹا گھڑسوار
ریاض جاوید
دوست یا دشمن
ریاض جاوید
جابر خاں
زبیدہ سلطانہ
نیلی روشنی کا راز
سیف الدین حسام
خوف ناک دھماکا
سیف الدین حسام
آستین کا سانپ
اشتیاق احمد
سانپوں کی ملکہ
ریاض جاوید
سو سال کی ناگن
زبیدہ سلطانہ
اُن کے کارنامے
اشتیاق احمد
جاسوس حجّام
فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور — راولپنڈی — کراچی

ستمبر کا تعلیم و تربیت مِلا۔ سرورق دیدہ
زیب تھا، لطیفے بھی خوب تھے۔ کارٹون
والے انعامی سلسلہ سے ہمیں اتفاق نہیں ہے
کیوں کہ یہ سلسلہ اور بھی بہت سے جریدوں میں
ہے۔

محمد جاوید اقبال، قلعہ سوبھا سنگھ

ستمبر کا "تعلیم و تربیت" ملا۔ سرورق بے حد
پسند آیا۔ نظموں میں، عید آئی ہے، طوطا،
ننھی عالیہ کا خط خوب تھا۔ میرزا ادیب
کی کہانی، رنگ دار بطخ نے رسالے کو چار دونی
آٹھ چاند لگا دیے۔ آسیب پسند نہیں آیا۔
"دل چسپ اور عجیب" اس دفعہ بہت اچھا رہا
لطیفے اور عبید زرا کانی کے لطیفے اچھے رہے
ہونہار ادیب میں ہم اور میٹرک، ماڈرن مُلا دو
پیازہ اور فیشن اچھی کاوشیں تھیں۔

محمد فیض۔ فیصل آباد

ستمبر کے شمارے کی تو شان ہی نرالی تھی
ایک طرف سرورق اپنی بہار دکھا رہا تھا اور
دوسری طرف اس کی خوب صورت تحریروں
نے ہمارے دل جیت لیے۔ میرزا ادیب کی کہانی

رنگ دار بطخ بہت پسند آئی۔ اس کے علاوہ
خالد بزمی کا "کاغان" کا سفر نامہ بہت
دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ لطیفے بڑے چٹ
پٹے تھے۔ ہونہار ادیب میں ماڈرن مُلا دو پیازہ،
ہم اور میٹرک بھی قابلِ تعریف تھے اور یہ عجیب
بات ہے کہ پورے رسالے میں صرف ایک کہانی
تھی جب کہ پچھلے شمارے میں سات آٹھ کہانیاں
تھیں۔

عقیلہ ربانی۔ کیمبل پور

ماہ ستمبر کا شمارہ پڑھا، پڑھ کر دل میں خوشیوں
اور مسرتوں کا طوفان اُمڈ آیا۔ کہانیوں میں آسیب
رنگ دار بطخ۔ اور سفر نامہ لاہور سے کاغان تک
قابلِ تعریف ہیں۔ نیز نظموں میں۔ سب کا خُدا اور
طوطا بھی بے حد پسند آئیں۔ لطیفے بہت ہی دلکش
اور چٹ پٹے تھے۔ ہونہار ادیب میں سچ اور
جھوٹ۔ کھٹے ملٹے اور فیشن قابلِ داد ہیں۔ ہماری
دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو دن دُگنی
رات چوگنی ترقی دے۔ آمین ثم آمین۔

پرستارِ ماہنامہ
سکندر حیات۔ حافظ آباد

ماہ ستمبر کا "تعلیم و تربیت" ملا۔ پڑھ کر انتہائی
راحت محسوس ہوئی۔ نظموں میں "سب کا خدا"
اور "عید آئی" بہت پسند آئیں۔ "آسیب"
اور "لاہور سے کاغان تک" دونوں مضمون دلچسپ
تھے۔ باقی لطیفے بھی چٹ پٹے تھے۔ دلچسپ
اور دائرۃ المعارف بھی خوب تھے۔ میری التجا
ہے "تعلیم و تربیت" کے کچھ صفحات بڑھا کر
سوال و جواب کا کالم بھی شروع کیا جائے۔

محمد عمران فیاض۔ لاہور

ستمبر کا تعلیم و تربیت ملا۔ یقین مانیے میں
رسالہ خریدتے ہی دکان سے گھر تک جاتے جاتے
راستے ہی میں پڑھنے لگا اور دو تین آدمیوں
سے ٹکر بھی ہو گئی۔ اس مرتبہ "روزے اور عید"
مضمون اور کہانی رنگ دار بطخ بہت ہی اچھے تھے
ہونہار ادیب میں۔ ہم اور میٹرک اور رزق کا
راز اچھی تھیں۔ لطیفے بھی مزے دار تھے۔
اللہ تعالیٰ ہمارے رسالے "تعلیم و تربیت" کو دن
دگنی اور رات چوگنی ترقی سے ہمکنار کرے (آمین)

محمد تسلیم عارف۔ لاہور

اس دفعہ آپ نے عابد نظامی صاحب کا انٹرویو
چھاپ کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ سرورق
تو بہت پسند آیا۔ مجھے نظموں میں سے "سب
کا خدا" اور "ننھی عالیہ کا خط" پسند آئیں اور
کہانیوں میں سے "روزے اور عید" "رنگ دار
بطخ" بہت ہی پسند آئیں باقی ہونہار ادیبوں
کی کہانیاں اور لطیفے بھی بہت پسند آئے۔ میری دعا ہے
کہ "تعلیم و تربیت" دن دوگنی رات تگنی نہیں
بلکہ چوگنی ترقی کرے۔

محمد جاوید بشیر۔ گجرات

عرصۂ دراز سے "تعلیم و تربیت" کا مطالعہ
کرتا چلا آ رہا ہوں۔ بے شک یہ بچوں کا مقبول
ترین رسالہ ہے۔ اور پاکستان بھر میں نکلنے والے
تمام رسالوں سے بہتر ہے۔ ستمبر کا تازہ شمارہ
ملا۔ اعلیٰ کہانیاں، مضمون اور خوب صورت سرورق
اس کی زینت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ امید ہے
کہ آیندہ رسالہ اس سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ میں
اپیل کرتا ہوں کہ رسالہ کی قیمت خواہ دو روپے
کر دیں۔ مگر اس کے صفحات ضرور بڑھائے
جائیں۔ آپ نے اعلان کیا ہے کہ آیندہ بچوں کو
لکھنے کے مواقع زیادہ دیے جائیں گے میں اس
کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

منظر ظفر کاظمی۔ ملتان!

ستمبر کا جگمگاتا رسالہ ملا۔ پڑھ کر دل باغ
باغ ہو گیا! سرورق تو بہت ہی اچھا تھا! کہانیوں
میں آسیب! رنگ دار بطخ! سچ اور جھوٹ!
ہم اور میٹرک! کھٹے ملٹے! رزق کا راز!
فیشن! بہادر باجی! بہت ہی پسند آئیں نظمیں
دلچسپ اور عجیب اور پہلے یہ پڑھے۔ لطیفے

بہت ہی خوب صورت تھے! اتنا پیارا رسالہ شائع کرنے پر ہماری طرف سے مبارک قبول فرمائیں

محمد اقبال شاد۔ (گوجرانوالہ)

"تعلیم و تربیت" کا نیا شمارہ پڑھا۔ جو بہت پسند آیا۔ ہمارے شہر میں "تعلیم و تربیت" پہلی تاریخ کو نہیں پہنچتا، اس لیے ہم خط جلدی نہیں لکھ سکتے۔ بعض دفعہ تو رسالہ مہینے کی سات یا آٹھ تاریخ کو پہنچتا ہے۔ اس لیے مہربانی فرما کر رسالہ جلد چھاپ دیا کریں تاکہ پہلی تاریخ کو ہر جگہ پہنچ جائے۔

اس ماہ کی کہانیوں میں "رنگ دار بطخ" اور "ہم اور میڑک" بہت اچھی تھیں۔ اس کے علاوہ سفر نامہ "لاہور سے کاغان تک" بھی بہت اچھا تھا۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ کیا "سوال و جواب" بند کر دیا گیا ہے اگر بند کر دیا گیا ہے تو مہربانی فرما کر جاری کر دیں کیوں کہ یہ اچھا سلسلہ تھا۔

محمد طاہر اقبال۔ دہاڑی

ماہ ستمبر کا شمارہ اگرچہ دیر سے ملا ہے مگر رسالہ ملتے ہی اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہوں جناب مقبول انور داؤدی، جناب خالد بزمی اور جناب میرزا ادیب کی نگارشات قابل داد و تحسین ہیں۔ جناب خالد بزمی کا مضمون "لاہور سے کاغان تک" بہر کیف اچھا ہے مگر اپنے ساتھ طوالت کی دُم لیے ہوئے ہے۔ براہ کرم نظموں کو شائع کرنے سے پہلے ان کا بھرپور جائزہ لیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ انعامی سلسلے میں اگر ادبی معمّا دوبارہ شروع کیا جائے تو بہتر رہے گا۔

خواجہ ضیاءاللہ۔ جہانوالہ

اس ماہ کا "پیارا" ملا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کہانیاں تو تمام بہت اچھی تھیں مگر جو مجھے زیادہ پسند آئیں، وہ یہ ہیں۔ لاہور سے کاغان تک (سفرنامہ) ہونہار ادیب۔ عبید زاکانی کے لطیفے، وہ آئی ہنسی وغیرہ

عبدالرزاق ملن مسافر۔ گوجرانوالہ

ستمبر کا شمارہ طویل انتظار کے بعد ملا مجموعی طور پر رسالہ پسند آیا۔ لیکن اس شمارے میں آپ نے صرف ایک کہانی شامل کی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ "لاہور سے کاغان تک"، کا سفر کافی دلچسپ تھا۔

ساجد رشید ناگرا۔ پیر محل

ماہ ستمبر کا شمارہ ملا۔ پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی اور کہانیاں بھی بڑی پسند آئیں۔ عابد نظامی کا انٹرویو بھی اچھا تھا۔ باقی آسیب، رنگ دار بطخ، لاہور سے کاغان تک، ہونہار ادیب سچ اور جھوٹ فیشن اور لطیفے بھی پسند آئے۔ خدا تعالیٰ اس رسالے کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے۔

عرفان ارم۔ فیصل آباد

اُردو کی مشہور داستانیں

داستانِ امیر حمزہ

داستانِ امیر حمزہ اُردو کی نہایت دل چسپ لیکن بہت طویل داستان ہے۔ مقبول جہانگیر نے اس داستان کو مختصر کر کے بچّوں کے لیے آسان زبان میں لکھا ہے۔ اس کے دس حصّے ہیں:

بادشاہ کا خواب	4.00
پُراسرار جزیرہ	4.00
نوشیرواں کی بیٹی	4.00
امیر حمزہ میدانِ جنگ میں	4.50
امیر حمزہ کوہِ قاف میں	4.00
شدّاد جادوگر	4.00
شہزادہ شہریار	4.00
عیاروں کی حکومت	4.50
جادو کا شہر	4.50
آخری مُہم	4.00

طلسمِ ہوش رُبا

طلسمِ ہوش رُبا، اصل میں، داستانِ امیر حمزہ ہی کا حصّہ ہے۔ اختر رضوی نے اس طویل داستان کو بچّوں کے لیے نہایت آسان زبان میں لکھا ہے۔ امیر حمزہ کے بعد طلسمِ ہوش رُبا ضرور پڑھیے۔ اس کے بھی دس حصّے ہیں:

عمرو کی غدّاری	4.00
عمرو کا بھوت	4.00
عمرو کے چیلے	4.00
عمرو کی عیّاری	4.00
عمرو کی گرفتاری	4.00
عمرو کی رہائی	3.50
عمرو کا انتقام	3.75
عمرو کی پریشانی	3.50
عمرو کے کارنامے	3.50
عمرو کا انجام	3.75

الف لیلہ

بچّوں کے لیے الف لیلہ کی یہ کہانیاں رتن ناتھ سرشار کی "ہزار داستان" سے لی گئی ہیں اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ زبان اور اندازِ بیان سرشار ہی کا رہے۔ اِس کے چھ حصّے ہیں:

ملکہ شہرزاد	3.50
گنجا لنگور	3.75
حجّام اور قزّاق	3.50
سندباد کے سات سفر	3.50
چین کی شہزادی	3.50
معروف موچی	3.50